20 ویں صدی کے 20 قائد

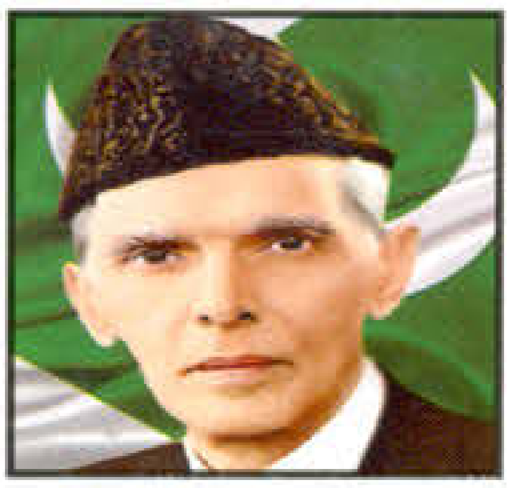

احمد بن بیلا (الجزائر)


ایف ڈی روزویلٹ (امریکہ)


احمد سوئیکارنو (انڈونیشیاء)


امام خمینی (ایران)


چرچل (برطانیہ)


قائداعظم (پاکستان)


کمال اتاترک (ترکی)


نیلسن مینڈیلا (جنوبی افریقہ)


ہٹلر (جرمنی)


ماوزے تنگ (چین)


شاہ عبداللہ عزیز (سعودی عرب)


لینن (سویت یونین)


کم ال سنگ (شمالی کوریا)


چارلس ڈیگال (فرانس)


یاسر عرفات (فلسطین)


فیڈل کاسترو (کیوبا)


نکرومہ (گھانا)


جمال عبدالناصر (مصر)


ہوچی منہ (ویت نام)


مہندس گاندھی (ہندوستان)

سینیٹر سید سجاد بخاری

بیسویں صدی کے بیس قائد

سینیٹر سجاد بخاری

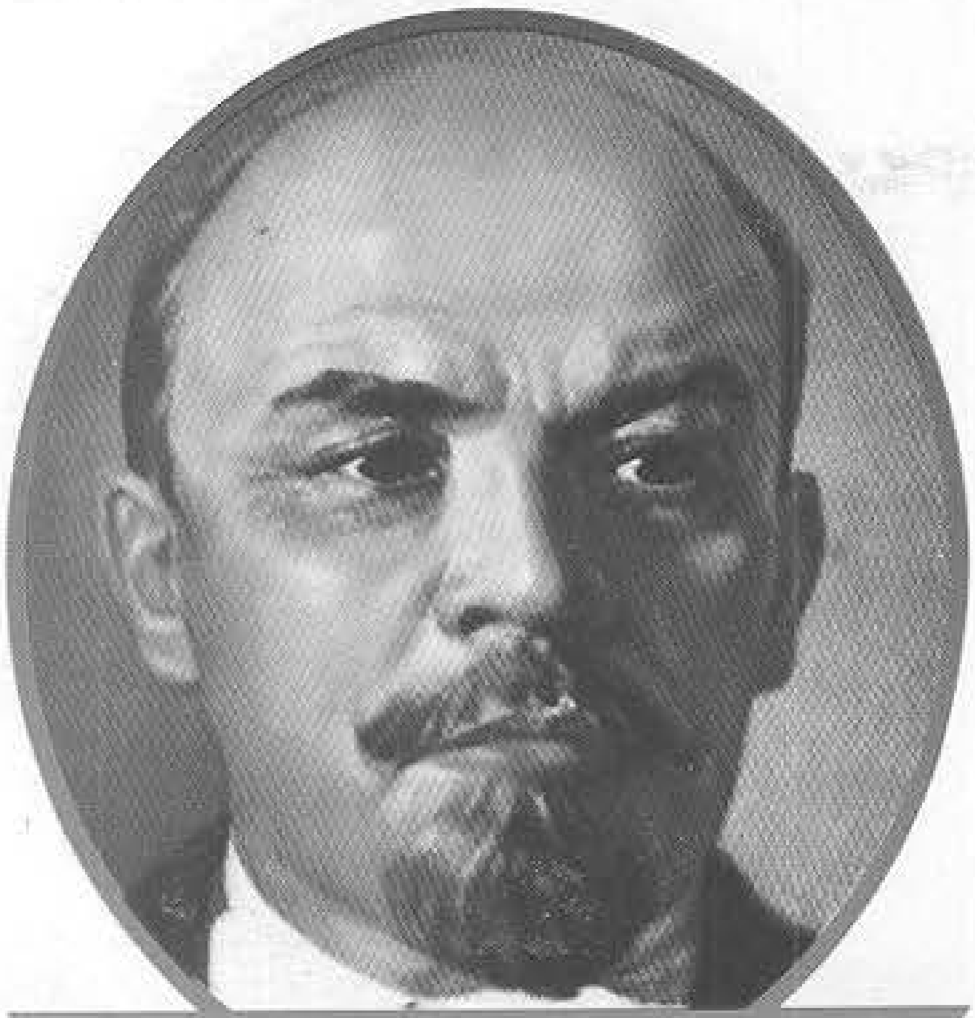
ابتک پبلیکیشنز
کراؤن بلڈنگ، گڑھی شاہو، لاہور
فون: 042-36313035, 042-36313037

انتساب

دنیا بھر کے حریت پسندوں کے نام



شاہ عبداللہ عزیز (سعودی عرب)



لینن (سویت یونین)



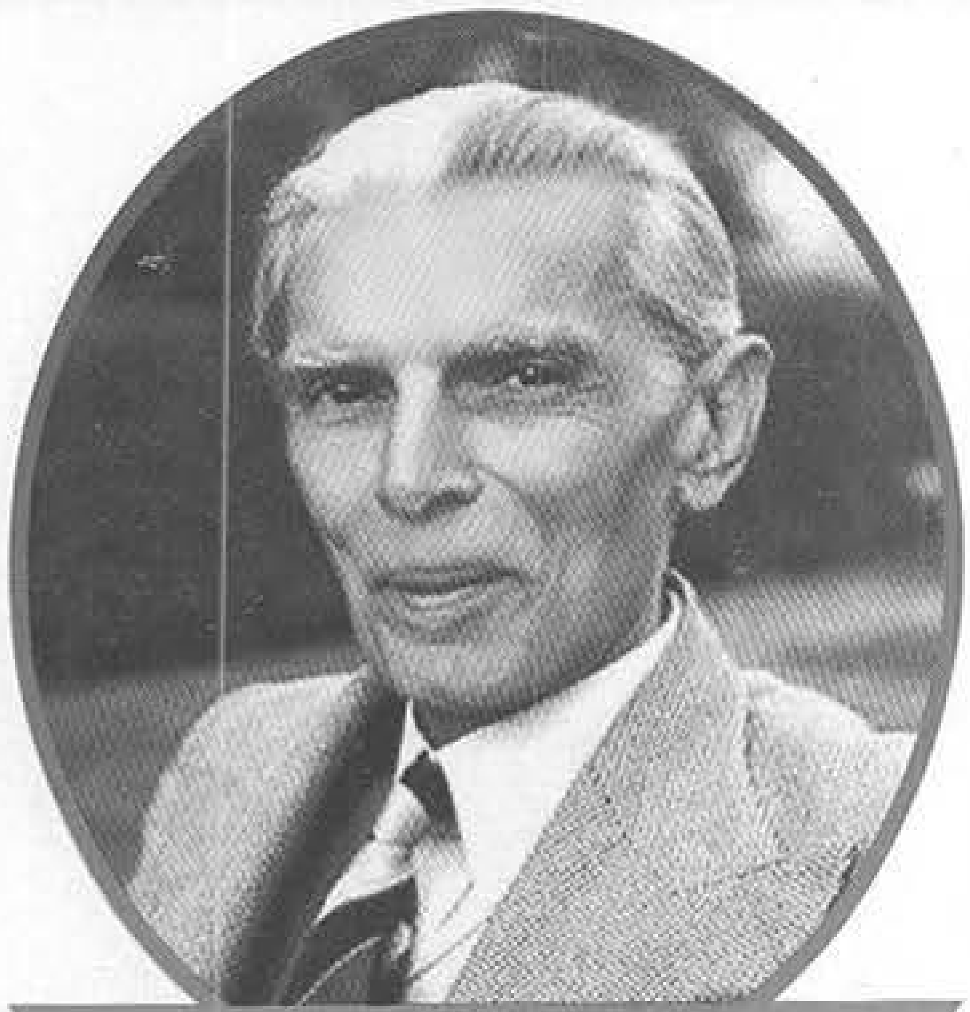
کم ال سنگ (شمالی کوریا)



چارلس ڈیگال (فرانس)



یاسر عرفات (فلسطین)



قائداعظم (پاکستان)



کمال اتاترک (ترکی)



نیلسن مینڈیلا (جنوبی افریقہ)



ہٹلر (جرمنی)



ماوزے تنگ (چین)



فیڈل کاسترو (کیوبا)



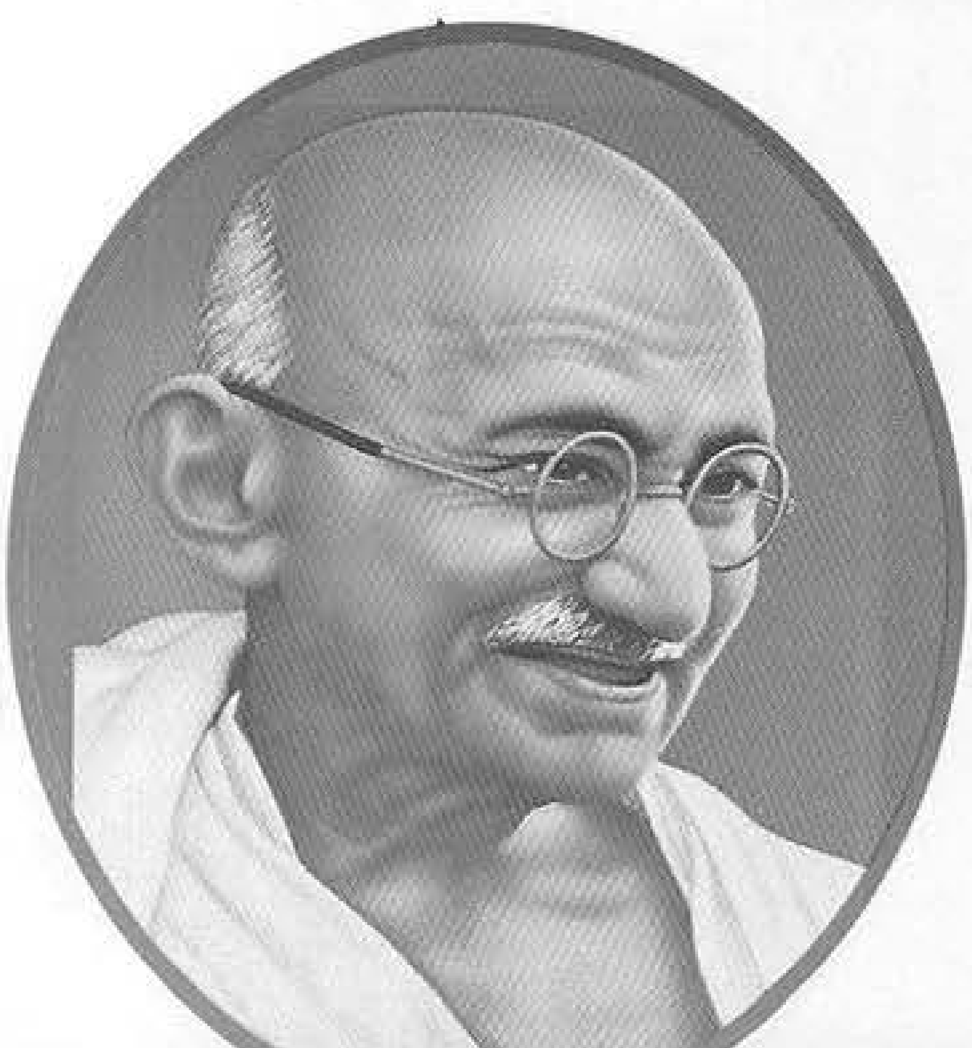
نکرومہ (گھانا)



جمال عبدالناصر (مصر)



ہوچی منہ (ویت نام)



مہندس گاندھی (ہندوستان)

پیش لفظ

قائدین کی صدی

20ویں صدی کو بجا طور پر قائدین کی صدی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس صدی کے دوران لاتعداد قومیں غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزادی کی نعمت سے ہمکنار ہوئیں۔ قوموں کی آزادی کی تحریکوں نے لاتعداد قائدین کو متعارف کروایا اور تاریخ کے اوراق میں ان کے مقام و مرتبہ کا تعین کیا۔ اس صدی میں انتہائی اہم سیاسی اور جغرافیائی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس صدی نے دو عالمی جنگیں دیکھیں جن میں دنیا کی تمام مملکتیں اور قومیں کسی نہ کسی شکل میں حصہ دار بنیں اور اس کے اثرات کی زد میں آئیں۔ پہلی جنگ عظیم 28 جولائی 1914ء کو شروع ہوئی اور 11 نومبر 1918ء تک یعنی چار سال تین ماہ اور 14 دن جاری رہی۔ اس جنگ میں 40 سے زائد ممالک شریک تھے۔ جنگ کے نتیجہ میں ایک کروڑ ساٹھ لاکھ افراد لقمۂ اجل بن گئے جبکہ دو کروڑ دس لاکھ افراد زخمی ہوئے۔ دوسری عالمی جنگ کا آغاز یکم ستمبر 1939ء کو ہوا۔ یہ جنگ چھ سال ایک دن جاری رہنے کے بعد 2 ستمبر 1945ء کو اختتام پذیر ہوئی۔ اس جنگ میں 61 ممالک براہ راست ملوث تھے جنہوں نے چھ کروڑ سے زائد انسانوں کو موت کی نیند سلا دیا۔ دونوں عالمی جنگوں کے دوران کچھ قومیں غلامی کا طوق اتارنے میں کامیاب ہوگئیں اور کچھ قومیں آزادی سے محروم ہو کر غلامی کی زنجیروں میں جکڑی گئیں۔ غلامی سے نجات کی خواہش نے حریت پسندی کو جنم دیا اور حریت پسندوں نے نئی تاریخ رقم کر دی۔ ان حریت پسندوں میں کچھ تو ایسے ہیں جنہوں نے اپنی قوم کو غیر ملکی سامراج کے تسلط سے نجات دلائی اور چند ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنے ہی ملک کی سامراجی اور عوام دشمن قوتوں کو شکست دے کر اپنے عوام کو ایک نئی زندگی سے روشناس کروایا۔

زیر نظر کتاب میں جن 20 قائدین کے حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں اُن میں بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح، ہندوستان کے مہاتما مہندس گاندھی، فرانس کی آزادی کے ہیرو چارلس ڈیگال، جرمنی کے مقبول لیڈر اڈولف ہٹلر الجزائر کے حریت پسند صدر احمد بن بیلا، انڈونیشیا کے عظیم لیڈر احمد سوئیکارنو، اسلامی جمہوریہ ایران کے انقلابی اور روحانی لیڈر امام خمینی، جدید مصر کے بانی جمال عبدالناصر، سعودی عرب کے بانی شاہ عبدالعزیز، جدید ترکی کے بانی کمال اتاترک، فلسطین کے انقلابی لیڈر یاسر عرفات، امریکہ کی تاریخ میں چار مرتبہ صدارتی انتخاب جیت کر نئی تاریخ رقم کرنے والے لیڈر فرینکلن روز ویلٹ، کیوبا کی آزادی کے ہیرو فیڈل کاسترو، پہلے آزاد افریقی ملک گھانا کے منفرد لیڈر کوامے نکرومہ، عوامی جمہوریہ چین کے بانی ماؤزے تنگ، عوامی جمہوریہ کوریا (شمالی کوریا) کے انقلابی لیڈر کم ال سنگ، جنوبی افریقہ کے عوام کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرنے والے لاثانی لیڈر نیلسن مینڈیلا، دنیا کی دوسری سپر پاور سوویت یونین کے بانی ولاڈیمیر لینن، دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کے دوران برطانوی قوم کے نجات دہندہ وزیراعظم ونسٹن چرچل اور ویتنام کی آزادی کے ہیرو عظیم سوشلسٹ انقلابی لیڈر ہوچی منہ شامل ہیں۔ تاہم بیسویں صدی میں ایسے معتبر لیڈرز بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں جن کی اپنے ملک وقوم کے لئے عظیم خدمات اور قائدانہ صلاحیتوں کا ذکر دنیا کی تاریخ میں سنہری حروف میں درج ہے۔ ایسے قائدین کا ذکر تفصیل کے ساتھ کسی ایک کتاب میں کرنا ممکن نہیں بلکہ ان قائدین کا مقام اور مرتبہ اس قدر بلند ہے کہ ان کی زندگی پر پہلے ہی کئی کتابیں لکھی اور شائع کی جا چکی ہیں۔

میں اپنے قارئین کی دلچسپی اور معلومات کے لئے بیسویں صدی کے مزید قائدین کا ذکر انتہائی مختصر الفاظ میں یہاں پیش کر رہا ہوں۔

حبیب بورقیبا (Habib Bourguiba)

حبیب بورقیبا اسلامی ملک تیونس کی آزادی کے ہیرو ہیں جو سو برس سے زائد فرانسیسی حکمرانوں کے زیر تسلط چلا آ رہا تھا۔ انقلابی لیڈر حبیب بورقیبا نے 1934ء میں اپنے ملک اور قوم کو آزاد کروانے کے لئے تحریک شروع کی اور انتہائی نامساعد حالات میں ایک خونی لڑائی کے بعد بالآخر 20 مارچ 1956ء کو اپنے ملک کو اغیار کی غلامی سے آزاد کروالیا۔ 25 جولائی 1956ء کو انہوں ریپبلک آف تیونیسیا کے پہلے صدر کے طور پر حلف اٹھایا اور 7 نومبر 1987ء تک بلاشرکت غیرے تیونس کے صدر رہے۔ حبیب بورقیبا اپنے عوام میں بے حد مقبول تھے اور اپنے ملک کو ایک جدید اور

ترقی یافتہ ملک بنانے میں ان کا کردار نا قابل فراموش ہے۔

مارشل ٹیٹو (Martial Tito)

مارشل ٹیٹو کا مکمل نام جوزف بروز ٹیٹو (Marshal Tito Jasip) تھا لیکن اپنے ملک کی آزادی کے لئے مزاحمتی تحریک کے قائد، گوریلا جنگ کے ماہر اور یوگوسلاو آرمی کے سپریم کمانڈر ہونے کے ناطے وہ پوری دنیا میں مارشل ٹیٹو (Martial Tito) کے نام سے پکارے اور یاد کئے جاتے تھے۔ اپنی اعلیٰ قائدانہ صلاحیتوں کے باعث وہ بین الاقوامی شہرت کے لیڈر شمار کئے جانے لگے۔ انہوں نے سوشلسٹ فیڈرل ریپبلک آف یوگوسلاویہ کی بنیاد رکھی اور 1943ء سے 1963ء تک اپنے ملک کے وزیراعظم رہے جبکہ 1963ء سے 1987ء تک یوگوسلاویہ کے صدر رہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران انہوں نے انتہائی اہم کامیابیاں حاصل کیں۔

چو این لائی (Zhou-Enlai)

چو این لائی چین میں رونما ہونے والے سُرخ انقلاب کے قائد موزے تنگ کے دست راست اور عوامی جمہوریہ چین کے بانیوں میں سے ایک انتہائی معتبر اور قد آور لیڈر تھے۔ چین کے عظیم لیڈر موزے تنگ چو این لائی پر بے پناہ اعتماد رکھتے تھے اور ان کی اعلیٰ خداداد صلاحیتوں کو انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اسی لئے 1949ء میں سامراجی قوتوں سے چینی قوم کو آزاد کروانے کے بعد ماؤزے تنگ نے چو این لائی کو اکتوبر 1949ء میں عوامی جمہوریہ چین کا وزیراعظم مقرر کیا اور 8 جنوری 1976ء کو اُن وفات تک یہ عہدہ اُن کے پاس رہا۔ چو این لائی نے عوامی جمہوریہ چین کو دنیا کا ایک جدید ترقی یافتہ اور فوجی لحاظ سے ایک انتہائی طاقتور ملک بنانے میں بے مثال کردار ادا کیا۔

اینور ہوکسہا (Enver Hoxha)

اینور ہوکسہا اسلامی ملک البانیہ کے ایک انقلابی لیڈر تھے جنہوں نے دوسری جنگ عظیم کے دوران اپنے ملک کو جرمنی اور اٹلی کے تسلط سے آزاد کروایا اور 24 اکتوبر 1944ء کو آزاد البانوی مملکت کے وزیراعظم کا عہدہ سنبھالا۔ بطور وزیراعظم وہ 18 جولائی 1954ء تک خدمات سرانجام دیتے رہے۔ بعدازاں وہ چیئرمین ڈیموکریٹک فرنٹ آف البانیہ کے سربراہ اور کمانڈر انچیف آف آرمڈ فورسز بن گئے اور 12 اپریل 1985ء تک اپنے ملک کے مطلق العنان حکمران رہے۔ اینور ہوکسہا نے اپنے ملک اور قوم کے لئے گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔ وہ سوشلسٹ نظریات کے

حامل لیڈر تھے اور کمیونسٹ پارٹی آف البانیہ کے بانی تھے جو نومبر 1941ء میں وجود پذیر ہوئی۔ ان کے مخالفین خاص طور پر امریکہ اور یورپی ممالک اُن کے طرز حکمرانی پر سخت تنقید کرتے رہے۔

چے گیویرا (Che-Guevara)

چے گیویرا کو دنیا کے انقلابی لیڈروں کے درمیان بھی ایک ہیرو کا درجہ حاصل ہے اور وہ جرأت، بہادری، استقامت اور اپنے نظریات پر کسی قسم کی مصلحت کا شکار نہ ہونے والوں کی علامت کے طور پر تاریخ کے اوراق میں زندہ ہیں۔ چے گیویرا کا ذکر بظاہر 1959ء میں رونما ہونے والے ''کیوبا'' کے انقلاب کے حوالے سے کیا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں فیڈل کاسترو کیوبا کے سربراہ مملکت بنے لیکن اس انقلاب کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں بنیادی کردار چے گیویرا نے ادا کیا اور انقلاب کے بعد بھی فیڈل کاسترو کے دست راست کی حیثیت سے نظام حکومت میں لاتعداد انقلابی تبدیلیاں لانے میں بھی چے گیویرا کی قابل رشک انتظامی صلاحیتوں کا عمل دخل تھا۔ چے گیویرا پیشہ کے اعتبار سے ایک میڈیکل ڈاکٹر تھے اور ارجنٹائن کے شہری تھے مگر انقلابی لیڈر فیڈل کاسترو کے ساتھ نظریاتی ہم آہنگی اور دوستی کے سبب وہ کیوبا کے انقلابی لیڈر کے طور پر منظر عام پر آئے۔ 1959ء کے انقلاب کے لیڈر فیڈل کاسترو نے انہیں نیشنل بنک آف کیوبا کا صدر مقرر کر دیا اور کیوبا کی معاشی اور صنعتی ترقی کے لئے انہیں وزیر صنعت کا قلمدان بھی سونپ دیا۔ چے گیویرا انقلاب کیوبا کو دیگر ممالک میں Export کرنے کے بھی متمنی تھے اور اس مقصد کے لئے انہوں نے خفیہ طور پر کئی ممالک کے دورے بھی کئے اور وہاں انقلابی سرگرمیوں کا اہتمام بھی کیا۔ اس مہم کے دوران 8/ اکتوبر 1967ء کو جنوبی امریکہ کے ایک ملک بولیویا (Bolivia) میں امریکی سراغ رساں ایجنسی CIA کے ہاتھوں وہ گرفتار ہوئے۔ اُن کی گرفتاری کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پوری دنیا میں پھیل گئی۔ بولیویا کے صدر نے چے گیویرا کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ انہیں 9 گولیاں ماری گئیں۔ 5 ٹانگوں میں ایک دائیں کندھے پر، ایک بازو میں، ایک سینے میں اور آخری گولی گردن میں ماری گئی۔ گولیاں کھاتے ہوئے بھی وہ اپنے انقلابی نظریات کا برملا اور با آواز بلند اظہار کرتے رہے۔ اپنی موت کے وقت چے گیویرا کی عمر محض 39 برس تھی۔

مسز بندرا نائیکے (Mrs. Bandaranaike)

مسز بندرا نائیکے سری لنکا کی سیاسی تاریخ کی ایک انتہائی معتبر شخصیت ہیں۔ 1960ء میں وہ سری لنکا کی وزیر اعظم منتخب ہوئیں اور انہیں ماڈرن دنیا میں پہلی خاتون سربراہ حکومت بننے کا اعزاز

حاصل ہوا۔ مسز بندرا نائیکے 1960ء سے 1965ء، 1970ء سے 1977ء اور 1994ء سے 2000ء تک سری لنکا کی وزیراعظم رہیں۔ مسز بندرا نائیکے کی سیاست اور شہرت دراصل ان کے خاوند مسٹر سُل مون بندرا نائیکے کی مرہون منت تھی جو 1956ء میں سری لنکا کے عام انتخابات میں ایک چار جماعتی اتحاد کے سربراہ کے طور پر کامیاب ہوئے اور سری لنکا کے وزیراعظم قرار پائے۔ 26 ستمبر 1959ء کو ان کے دفتر میں ہی گھس کر ان کے ایک سیاسی مخالف نے انہیں قتل کر دیا۔ بندرا نائیکے کے قتل کے بعد اُن کی اہلیہ اُن کی سیاسی وارث کے طور پر میدان سیاست میں اتریں اور ایک طویل عرصہ تک سری لنکا کی سیاست پر اپنی گرفت مضبوط رکھی۔ بطور وزیراعظم انہوں نے اپنے ملک اور قوم کی ترقی اور خوشحالی کے لئے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ اُن کی بیٹی کمارا ٹنگا بھی 1994ء میں سری لنکا کی صدر منتخب ہوئیں اور 2005ء تک عہدہ صدارت پر برقرار رہیں۔

لیاقت علی خان (Liaquat Ali Khan)

نواب زادہ لیاقت علی خان پاکستان کے پہلے وزیراعظم ہونے کے ساتھ ساتھ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے دست راست اور انتہائی قابل اعتماد ساتھی تھے۔ نوابزادہ لیاقت علی خان نے قیام پاکستان کی جدوجہد میں انتہائی اہم کردار ادا کیا اور قیام پاکستان کے بعد نوزائیدہ مملکت کو مضبوط، خوشحال اور مستحکم بنانے میں بے مثال کردار ادا کیا۔ 16 اکتوبر 1951ء کو لیاقت باغ راولپنڈی میں ایک جلسہ عام سے خطاب کے دوران ایک شقی القلب شخص سید اکبر نے انہیں گولی مار کر شہید کر دیا۔ لیاقت علی خان پاکستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ عرصہ وزارت عظمیٰ پر فائز رہنے والے واحد قومی لیڈر تھے۔ بطور وزیراعظم انہوں نے چار برس دو ماہ اور دو دن خدمات سرانجام دیں۔ وزیراعظم ہونے کے ساتھ ساتھ وزارت دفاع اور وزارتِ خارجہ کے قلمدان انہوں نے اپنے پاس رکھے۔

جوزف سٹالن (Joseph Stalin)

1917ء کے روسی انقلاب اور سوویت یونین کے قیام کے اصل ہیرو تو لینن کو تسلیم کیا جاتا ہے مگر سوویت یونین کو ایک سپر پاور بنانے میں بنیادی کردار جوزف سٹالن کا تھا۔ جوزف سٹالن اپنے قائد لینن کی 1924ء میں وفات کے بعد سوویت یونین مطلق العنان حکمران کے طور پر سامنے آئے اور 1953ء میں اپنی وفات تک سوویت یونین کے سیاہ وسفید کے مالک رہے اور سوویت یونین کو

ایک نا قابل تسخیر طاقت بنا دیا۔ سٹالن جارجیا (Georgia) کے گاؤں میں رہائش پذیر ایک غریب ''موچی'' کے ہاں 1879ء میں پیدا ہوئے۔ 1901ء میں انہوں نے جارجین سوشل ڈیموکریٹک پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ 1912ء میں لینن نے انہیں بالشوک سینٹرل کمیٹی کا رکن بنا دیا۔ 1917ء کے روسی انقلاب کے بعد سٹالن اپنی خداداد صلاحیتوں کے باعث لینن کے انتہائی با اعتماد ساتھی سمجھے جانے لگے۔ 1922ء میں وہ روسی کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری جنرل منتخب ہو گئے اور 1924ء میں لینن کے انتقال کے بعد انہوں نے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے، اپنے تمام مخالفین کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا اور اقتدار پر اپنی گرفت انتہائی مضبوط کر لی۔ 1928ء میں انہوں نے سوویت یونین میں ایک زبردست صنعتی انقلاب کا آغاز کیا اور سوویت یونین کی سرحدوں کو بہت وسیع کر دیا۔ جوزف سٹالن نے دوسری جنگ عظیم میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ سٹالن 1953ء میں 74 برس کی عمر میں دماغ کی شریان پھٹ جانے کے باعث انتقال کر گئے۔

جواہر لال نہرو (Jawaharlal Nehru)

جواہر لال نہرو اگست 1947ء میں ہندوستان کی آزادی کے بعد پہلے وزیر اعظم مقرر ہوئے اور 1964ء میں اپنی وفات تک مسلسل ہندوستان کے وزیر اعظم رہے۔ جواہر لال نہرو 1889ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اعلیٰ تعلیمی اداروں سے تعلیم حاصل کی۔ برطانیہ سے انہوں نے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ ہندوستان کی برطانوی راج سے آزادی کی جدوجہد میں جواہر لال نہرو پیش پیش رہے۔ اس دوران انہیں متعدد بار جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانا پڑا۔ 1919ء میں برطانوی فوج کے ہاتھوں امرتسر میں ہندوستانیوں کے قتل عام کے بعد جواہر لال نہرو انڈین نیشنل کانگرس کے صدر بن گئے اور انگریز حکومت کے خلاف تحریک شروع کر دی۔ 1930ء سے 1936ء کے دوران وہ زیادہ عرصہ پابند سلاسل رہے۔ پھر 1942ء سے 1945ء تک مسلسل قید کاٹی۔ جواہر لال نہرو مہاتما گاندھی کے دست راست تھے۔ 1964ء میں جواہر لال نہرو کی وفات کے محض دو سال بعد اُن کی بیٹی اندرا گاندھی ہندوستان کی وزیر اعظم منتخب ہو گئیں اور 1966ء سے 1977ء تک مسلسل وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز رہیں۔ 1980ء میں ایک بار پھر اندرا گاندھی منتخب ہو گئیں اور 1984ء میں اپنے ہی گارڈز کے ہاتھوں قتل ہونے تک ہندوستان کی وزیر اعظم رہیں۔ اندرا گاندھی کے قتل کے بعد اُن کے بیٹے راجیو گاندھی وزیر اعظم بن گئے۔ راجیو گاندھی 1991ء میں قتل کر دیئے گئے۔

جان ایف کینیڈی (John F. Kennedy)

امریکہ کی تاریخ میں جارج واشنگٹن اور ابراہیم لنکن کے بعد سب سے زیادہ مقبولیت اور شہرت رکھنے والے صدر جان ایف کینیڈی ہیں جو جنوری 1961ء سے 22 نومبر 1963ء تک ریاستہائے متحدہ امریکہ کے صدر رہے۔ کینیڈی امریکہ کے 35ویں صدر تھے اور محض 1037 دن تک عہدہ صدارت پر فائز رہ سکے۔ ایک جنونی شخص لی ہاروی اوسوالڈ (Lee Harvey Oswald) نے 22 نومبر 1963ء کو انہیں اُس وقت گولی ماردی جب وہ امریکی ریاست ٹیکساس کے شہر دالاس میں ایک کھلی کار میں سوار تھے۔ قاتل خود بھی محض دو روز بعد قتل کر دیا گیا مگر ہر سطح کی تحقیقات کے باوجود جان ایف کینیڈی کے قتل کے اصل محرکات سامنے نہ آسکے۔ جان ایف کینیڈی اپنی کرشماتی شخصیت اور مثالی سیاست کے باعث آج بھی امریکی عوام کے دلوں اور ذہنوں پر حکومت کر رہے ہیں۔ جان ایف کینیڈی 19 مئی 1917ء کو پیدا ہوئے۔ 1940ء میں انہوں نے ہاورڈ یونیورسٹی سے گریجوایشن کی۔ 1941ء سے 1945ء تک امریکی نیوی میں خدمات سرانجام دیں۔ 29 برس کی عمر میں وہ امریکی ایوان نمائندگان کے رکن منتخب ہو گئے اور 1947ء سے 1953ء تک رکن رہے۔ 1952ء میں جان ایف کینیڈی امریکی سینٹ کے رکن منتخب ہو گئے اور 1958ء میں دوبارہ بطور ممبر سینٹ اُن کو منتخب کر لیا گیا۔ 1960ء کے صدارتی انتخابات میں وہ رچرڈ نکس کو شکست دے کر امریکہ کے صدر بن گئے۔ جان ایف کینیڈی امریکہ کی تاریخ کے سب سے کم عمر صدر تھے۔

ڈاکٹر محمد مصدق (Dr. Muhammad Mosaddegh)

ڈاکٹر محمد مصدق ایران کے انتہائی مقبول اور جمہوریت پسند لیڈر تھے۔ 1950ء میں ان کی جماعت بھاری اکثریت سے انتخابات جیت کر حکومت بنانے میں کامیاب ہوگئی اور ڈاکٹر محمد مصدق نے وزیراعظم کا عہدہ سنبھال لیا۔ ایران میں اگرچہ رضا شاہ پہلوی کی شہنشاہیت قائم تھی مگر ڈاکٹر محمد مصدق نے اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ انہوں نے ایران انقلابی اصلاحات کا آغاز کر دیا اور تیل کی صنعت جو برٹش پیٹرولیم کمپنی کے تحت 1930ء سے برطانوی کنٹرول میں چلی آ رہی تھی کو قومی تحویل میں لے لیا۔ ڈاکٹر مصدق کی حکومت میں اپنی بے بسی محسوس کرتے ہوئے شاہ ایران رضا شاہ پہلوی ملک سے فرار ہو گئے۔ ڈاکٹر مصدق نے 1951ء سے 1953ء تک ایران پر حکومت کی۔ 1953ء برطانوی حکومت اور امریکی خفیہ ایجنسی سی آئی اے

کی مدد سے ایرانی فوج کے سربراہ جنرل فیصل اللہ زاہدی نے مصدق حکومت کا تختہ الٹ دیا اور شاہ ایران کو واپس بلا کر عنان حکومت سونپ دی۔ شاہ ایران نے ڈاکٹر مصدق کو گرفتار کر کے تین برس تک پابند سلاسل رکھا اور پھر 5 مارچ 1957ء کو ان کی وفات تک ان کے گھر پر نظر بند رکھا۔

عدنان میندرس (Adnan Menderes)

عدنان میندرس ترکی کے ایک انتہائی مقبول لیڈر تھے۔ انہوں نے 1946ء میں ڈیموکریٹک پارٹی کی بنیاد رکھی اور 1950ء کے عام انتخابات میں بھاری اکثریت کے ساتھ ترکی کے وزیراعظم منتخب ہو گئے۔ عدنان میندرس نے 1950ء سے 1960ء تک ترکی پر حکومت کی۔ اُن کی زبردست عوامی شہرت اور مقبولیت کے باعث ترکی کی مضبوط فوج کے ساتھ اُن کے اختلافات پیدا ہو گئے۔ 27 مئی 1960ء میں فوج نے اُن کی حکومت کا تختہ الٹ کر انہیں تمام اہم ساتھیوں سمیت گرفتار کر لیا۔ عدنان میندرس پر مقدمہ چلا کر انہیں سزائے موت سنا دی گئی۔ پاکستان سمیت دنیا کے بیشتر ممالک نے ترک حکومت سے اُن کی جاں بخشی کی اپیل کی مگر جنرل گُرسل کی قیادت میں حکمرانی کرنے والی فوجی جنتا نے کسی کی نہ سنی اور 17 ستمبر 1961ء کو عدنان میندرس کو پھانسی دے دی گئی۔

شاہ فیصل بن عبدالعزیز (Shah Faisal Bin Abdul Aziz)

شاہ فیصل بن عبدالعزیز سعودی عرب کے تیسرے بادشاہ تھے جو 1964ء میں اپنے بھائی سعود بن عبدالعزیز کو اقتدار سے جبراً علیحدہ کرنے پر سعودی عرب کے بادشاہ بنے اور 1975ء تک سعودی عرب کے حکمران رہے۔ شاہ فیصل نہ صرف پوری مسلم امہ بلکہ دنیا کے تقریباً تمام ممالک کے عوام میں ایک جہاں دیدہ، زیرک اور مدبر لیڈر کے طور پر عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ شاہ فیصل مسلم ممالک کے اتحاد کے زبردست داعی تھے اور تمام مسلم ممالک کی دل کھول کر امداد کرتے تھے۔ شاہ فیصل خادم حرمین الشریفین ہونے کے ساتھ ساتھ سعودی عرب اور ایک ماڈرن اور ترقی یافتہ ملک بنانے کے لئے کوشاں تھے۔ انہوں نے اپنے عوام کی بہتری کے لئے متعدد سماجی اصلاحات کیں۔ اسرائیل کے خلاف عرب ممالک کی جنگ میں انہوں نے عرب ملکوں کا بھرپور ساتھ دیا اور ہر قسم کی امداد فراہم کی۔ اسرائیل کی حمایت کرنے والے ممالک جن میں امریکہ، برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک شامل تھے، کے خلاف شاہ فیصل نے تیل کو بطور ہتھیار استعمال کیا اور ان ممالک کے لئے تیل کی سپلائی بند کر دی جس کے باعث یہ ممالک انتہائی اقتصادی مشکلات کا شکار ہو گئے۔

شاہ فیصل 1974ء میں وزیراعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کی دعوت پر پاکستان تشریف لائے اور لاہور میں منعقدہ اسلامی سربراہی کانفرنس میں شرکت کی۔ پاکستان کے عوام بھی شاہ فیصل کے ساتھ بے پناہ محبت رکھتے تھے۔ مارچ 1975ء میں شاہ فیصل کے ایک بھتیجے نے شاہی محل میں گھس کر انہیں شہید کر دیا۔ پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں شاہ فیصل کی یاد میں وسیع و عریض اور عالی شان مسجد تعمیر کی گئی ہے جسے فیصل مسجد کا نام دیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ فیصل کی شہادت ایک بین الاقوامی سازش کا نتیجہ تھی۔

کورازون اکینو (Corazon Aquino)

کورازون اکینو فلپائن کی انتہائی مقبول عوامی لیڈر رہیں۔ 1986ء میں فلپائن کا عہدہ صدارت سنبھالنے پر انہیں ایشیا کی پہلی خاتون صدر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ کورازون اکینو 1986ء سے 1992ء تک عہدہ صدارت پر فائز رہیں۔ کورازون اکینو کی تمام تر سیاست اُن کے خاوند Beniqno Aquino کے نظریات سے وابستہ رہی جو فلپائن کے منتخب سینیٹر تھے اور عوام کے بنیادی حقوق کے علمبردار اور حقیقی جمہوریت کے حامی تھے۔ انہوں نے فلپائن کے ڈکٹیٹر مارکوس (Marcos) کی آمریت کے خلاف عوامی تحریک کا آغاز کیا۔ 1972ء میں مارکوس نے فلپائن میں آئین اور بنیادی حقوق معطل کر کے مارشل لاء نافذ کر دیا اور تمام تر اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ شدید مخالفت پر انہوں نے Benigno Aquino کو گرفتار کر لیا اور آٹھ برس تک انہیں پابند سلاسل رکھ کر زبردست تشدد کا نشانہ بنایا۔ 1980ء میں وہ عارضہ قلب میں مبتلا ہو گئے۔ دل کی تکلیف اور بین الاقوامی دباؤ کے باعث علاج کی غرض سے مسٹر اکینو کو امریکہ بھیج دیا گیا۔ 1983ء میں اُن کی وطن واپسی پر حکومتی حراست میں انہیں قتل کر دیا گیا۔ اپنے خاوند کے اس بہیمانہ قتل کے خلاف اور مارکوس کی ظالمانہ اور آمرانہ حکومت کے خاتمہ کے لئے کورازون اکینو نے ملک گیر احتجاجی تحریک شروع کر دی۔ مارکوس جو 1965ء سے فلپائن کے صدارتی منصب پر براجمان تھے، نے اس تحریک کو کچلنے کے لئے ہر ممکن ہتھکنڈے استعمال کئے۔ فروری 1986ء میں مارکوس نے ایک بار پھر دھونس اور دھاندلی کے باعث صدارتی انتخاب جیت لیا مگر مسز کورازون اکینو کے صدارتی انتخاب کو یکسر مسترد کر دیا اور مارکوس کو ایوان اقتدار سے نکالنے کی جدوجہد جاری رکھی۔ بالآخر مارکوس کو اپنی شکست تسلیم کرنا پڑی اور 25 فروری 1986ء کو وہ اپنے خاندان سمیت ملک سے فرار ہو گئے۔

مارکوس کی اقتدار سے علیحدگی پر کورازون اکینو نے فلپائن کی صدارت کا عہدہ سنبھال لیا اور 1992ء تک اس عہدہ پر برقرار رہیں۔

شیخ زید بن سلطان النہیان (Sheikh Zayed bin Sultan Al Nahyan)

شیخ زید بن سلطان النہیان متحدہ عرب امارات کے بانی اور پہلے صدر تھے جو 33 برس تک عہدہ صدارت پر فائز رہے۔ 1971ء میں برطانوی راج کے اختتام کے وقت خلیج کی چھوٹی چھوٹی رہاستیں اپنی الگ الگ شناخت کے ساتھ قائم تھیں۔ شیخ زید بن سلطان نے اپنی اعلیٰ قائدانہ صلاحیتوں کے باعث ان ریاستوں کو ایک فیڈریشن میں تبدیل کر کے ایک ملک کا درجہ دلوا دیا اور متحدہ عرب امارات کا قیام وجود پذیر ہوا۔ متحدہ عرب امارات میں سات ریاستیں: ابوظہبی (Abu Dhabi)، دبئی (Dubai)، شارجہ (Sharjah)، العین (Al-Ain)، راس الخیمہ (Ras Al-Khamah)، فوجیرہ (Fujairah) اور ہاتا (Hatta) شامل ہیں۔ متحدہ امارات کا دارالحکومت ابوظہبی ہے۔ شیخ زید بن سلطان مسلم امہ کے اتحاد کے داعی تھے اور مسلمان ممالک کی حمایت میں پیش رہتے تھے۔ وہ انتہائی مخیّر اور علم دوست حکمران تھے۔ انہوں نے دنیا کی اہم یونیورسٹیوں میں خطیر رقم خرچ کر کے ''زید سینٹر'' قائم کروائے۔ ان یونیورسٹیوں میں ہاورڈ یونیورسٹی امریکہ، لندن سکول آف اکنامکس اور پنجاب یونیورسٹی لاہور شامل ہیں۔ شیخ زید بن سلطان پاکستان کے بہترین دوست تھے اور انہوں نے پاکستان کو اپنا دوسرا گھر قرار دیا ہوا تھا۔ انہوں لاہور اور رحیم یار خان میں اپنی رہائش کے لئے محلات بھی تعمیر کرائے۔ لاہور میں شیخ زید ہسپتال اور کراچی میں شیخ سلطان ٹرسٹ کی تعمیر ان کی پاکستان دوستی کی زندہ مثالیں ہیں۔ 2 نومبر 2004ء میں 86 برس کی عمر میں شیخ زید بن سلطان اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ مبارک بن زید بن سلطان متحدہ عرب امارات کے صدر مقرر ہوئے۔

لی کوان یو (Lee Kuan Yew)

لی کوان یو سنگاپور کے پہلے وزیراعظم تھے جو 30 مئی 1959ء کو منعقد ہونے والے قومی انتخابات میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہوکر وزیراعظم بنے اور 1990ء تک یعنی 30 برس تک مسلسل ریپبلک آف سنگاپور کے وزیراعظم رہے۔ انہیں فادر آف سنگاپور کہا جاتا ہے۔ انہوں نے سنگاپور کو دنیا کا ایک جدید ترین اور ترقی یافتہ ملک بنا دیا۔ انہوں نے ایشیائی ملکوں کی تنظیم آسیان

ASEAN (Association of South Asian Nations) کی بنیاد رکھی۔ 1990ء میں وزارت عظمیٰ کا عہدہ چھوڑنے کے بعد بھی وہ سنگاپور کی ترقی اور خوشحالی کے لئے اپنی خدمات پیش کرتے رہے۔ لی کوان لو 1990ء سے 2011ء تک سنگاپور کی کابینہ میں بطور سینئر وزیر شامل رہے۔

ذوالفقار علی بھٹو (Zulfiqar Ali Bhutto)

ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کی سیاست میں بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے بعد سب سے زیادہ عوامی مقبولیت رکھنے والے لیڈر تھے اور ان کی یہ مقبولیت ان کے دنیائے فانی سے رخصت ہونے جانے کے بعد بھی کبھی ختم نہیں ہوئی۔ ذوالفقار علی بھٹو کی جدوجہد کے نتیجہ میں پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ حقِ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عوام کو براہ راست ووٹ دینے کا موقع ملا اور وطن عزیز کے مظلوم اور پسے ہوئے طبقات کو اپنے بنیادی حقوق کے حصول کے لئے آواز بلند کرنے کی جرأت اور طاقت نصیب ہوئی۔ 1970ء کے عام انتخابات میں عوام نے ذوالفقار علی بھٹو کی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی کو زبردست کامیابی سے ہمکنار کیا اور وہ پاکستان کے پہلے باضابطہ طور پر منتخب وزیراعظم قرار پائے۔

ذوالفقار علی بھٹو 5 جنوری 1928ء کو لاڑکانہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے اپنے آبائی شہر میں ہی حاصل کی۔ پھر ممبئی چلے گئے جہاں اُن کے والد سر شاہنواز بھٹو متحدہ ہندوستان کے وزیر صحت کے طور پر خدمات سرانجام دے رہے تھے، کچھ عرصہ وہاں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ مزید تعلیم کے لئے امریکہ چلے گئے۔ جہاں انہوں نے کیلیفورنیا یونیورسٹی سے سیاسیات میں بی اے آنرز کیا۔ 1950ء میں ذوالفقار علی بھٹو انگلستان چلے گئے جہاں آکسفورڈ یونیورسٹی سے انہوں 1956ء میں ایم اے سیاسیات کی ڈگری حاصل کی۔ بعدازاں انہوں نے بارایٹ لاء بھی کرلیا۔

1956ء میں صدر پاکستان اسکندر مرزا نے انہیں اپنے قریبی رفقاء میں شامل کرلیا اور اقوام متحدہ سمیت کئی دیگر ممالک میں انہیں پاکستان کی نمائندگی کے لئے بھیجا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی ذہانت اور قابلیت کے پیش نظر 1958ء میں صدر ایوب خاں نے انہیں اپنی کابینہ میں شامل کرلیا۔ 28 اکتوبر 1958ء کو انہیں معدنیات کا وزیر مقرر کیا گیا۔ 1960ء میں انہیں تعمیرات، اطلاعات اور اقلیتی امور کی وزارت بھی سونپ دی گئی۔ 23 جنوری 1963ء کو ذوالفقار علی بھٹو کو وزیر خارجہ مقرر کر دیا گیا۔ 16 جون 1966ء کو صدر جنرل ایوب خان کے ساتھ معاہدۂ تاشقند پر شدید اختلافات کے باعث ذوالفقار علی بھٹو نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا اور حکومت کے خلاف عوامی رابطہ مہم شروع کردی۔

30 نومبر 1967ء کو ذوالفقار علی بھٹو نے لاہور میں اپنی سیاسی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام کا اعلان کر دیا۔ 13 نومبر 1968ء کو حکومت نے انہیں گرفتار کر کے میانوالی جیل میں قید کر دیا۔ جنوری 1969ء میں انہیں ساہیوال جیل منتقل کر دیا گیا۔ زبردست عوامی دباؤ پر 18 فروری 1969ء کو حکومت نے ذوالفقار علی بھٹو کو رہا کر دیا مگر ایوب حکومت عوامی احتجاج کا مقابلہ نہ کر سکی اور 25 مارچ 1969ء کو ایوب حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور جنرل یحیٰی خان نے اقتدار سنبھال لیا۔ دسمبر 1970ء کے عام انتخابات کے نتیجہ میں ذوالفقار علی بھٹو اقتدار کے حقدار بن گئے مگر جنرل یحیٰی خان عوامی نمائندوں کو اقتدار منتقل کرنے کے لئے تیار نہ تھے جس سے مشرقی اور مغربی پاکستان میں سیاسی کشمکش اور شدید بحران پیدا ہو گیا۔ ادھر ہندوستان نے اس صورتِ حال سے خوب فائدہ اٹھایا اور 16 دسمبر 1971ء کو پاکستان کو دولخت کر کے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنا دیا۔ ملک کے دو ٹکڑے ہو جانے پر جنرل یحیٰی خان کو اقتدار چھوڑنا پڑا اور 20 دسمبر 1971ء کو جنرل یحیٰی نے عنان حکومت ذوالفقار علی بھٹو کو سونپ دی۔ ذوالفقار علی بھٹو ایک سال آٹھ ماہ اور پچیس روز تک پاکستان کے صدر رہے مگر 14 اگست 1973ء کو آئین کے نفاذ کے بعد انہوں نے بطور وزیراعظم حلف اٹھا لیا اور پھر 6 جولائی 1977ء تک پاکستان کے وزیراعظم رہے۔ انہوں نے اپنے دور حکومت میں لاتعداد اصلاحات متعارف کروائیں جس سے ان کی عوامی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ 5 جولائی 1977ء کو چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق نے ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور بھٹو سمیت اُن کی کابینہ کے ممبران کو گرفتار کر لیا۔ 24 روز بعد ذوالفقار علی بھٹو کو رہا کیا گیا مگر 2 ستمبر 1977ء کو ایک مقدمہ قتل میں انہیں پھر گرفتار کر لیا اور 19 ستمبر کو جوڈیشل ریمانڈ لے کر انہیں جیل بھیج دیا گیا۔ پھر انہیں کبھی رہائی نہ ملی اور 4 اپریل 1979ء کو انہیں تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد اُن کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہو گیا اور ان کی اہلیہ بیگم نصرت بھٹو اور صاحبزادی بے نظیر بھٹو نے ذوالفقار علی بھٹو کی سیاست کو زندہ رکھا۔ اگرچہ بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کو اس جدوجہد کے نتیجہ میں قید و بند اور تشدد سمیت ناقابل بیان حد تک مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر اُن کی جدوجہد رنگ لائی اور 1988ء کے عام انتخابات کے نتیجہ میں محترمہ بے نظیر بھٹو کو اپنے عظیم والد ذوالفقار علی بھٹو کی طرح وزیراعظم پاکستان کا منصب مل گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے نام اور نظریہ کی بنیاد پر پاکستان کے عوام نے ہمیشہ پاکستان پیپلز پارٹی کو ہر مرتبہ انتخابات میں زبردست کامیابی سے ہمکنار کیا۔ 1993ء میں عام انتخابات میں

اکثریت حاصل کرنے کے باعث حکومت بنانے میں کامیاب ہوئی اور محترمہ بے نظیر بھٹو دوسری مرتبہ وزیراعظم پاکستان منتخب ہوگئیں۔ 27 دسمبر 2007ء میں محترمہ بے نظیر کو بھی شہید کر دیا گیا مگر 2008ء کے انتخابات میں بھی پاکستانی عوام نے ذوالفقار علی بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کی پارٹی کو کامیابی سے ہمکنار کر دیا اور پیپلز پارٹی آئندہ پانچ برس تک اقتدار کے ایوانوں میں موجود رہی۔ ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کی سیاست میں ہمیشہ زندہ وتابندہ رہیں گے۔

مارگریٹ تھیچر (Margaret Thatcher)

مسز مارگریٹ تھیچر برطانیہ کی صدیوں پر محیط تاریخ میں پہلی خاتون تھیں جو وزیراعظم منتخب ہوئیں اور مسلسل گیارہ برس تک برطانیہ کی مضبوط ترین وزیراعظم رہیں جبکہ برطانوی کنزرویٹو پارٹی (Conservative Party) کی 1975ء سے 1990ء تک سربراہ رہیں۔ مارگریٹ تھیچر کو برطانوی سیاست میں ''آئرن لیڈی'' (Iron Lady) کا لقب بھی دیا گیا ہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی سے قانون اور کیمسٹری کی اعلیٰ ڈگری ہولڈر مارگریٹ تھیچر 4 مئی 1979ء سے 28 نومبر 1990ء تک وزارت عظمیٰ پر فائز رہیں۔ اس سے قبل وہ 11 فروری 1975ء سے 4 مئی 1979ء تک برطانوی پارلیمنٹ میں لیڈر آف اپوزیشن رہیں۔ 5 مارچ 1974ء سے 11 فروری 1975ء تک وہ کابینہ میں وزیر ماحولیات اور 20 جون 1970ء سے 4 مارچ 1974ء تک وزیر تعلیم وسائنس رہیں۔ مارگریٹ تھیچر 8 اکتوبر 1959ء کو پہلی مرتبہ برطانوی پارلیمنٹ کی رکن منتخب ہوئیں اور 19 اپریل 1992ء تک مسلسل رکن پارلیمنٹ رہیں۔ مارگریٹ تھیچر کی وزارت عظمیٰ کے دوران انہیں لاتعداد سنگین مسائل سے دوچار ہونا پڑا مگر انہوں نے انتہائی جرأت اور ذہانت سے اُن مسائل کا مقابلہ کیا۔ سب سے اہم مسئلہ ''ریپبلک آف آئرلینڈ'' کی خودمختاری کے لئے آئرش ریپبلکن آرمی کی جاری خونی جدوجہد تھی جس میں سینکڑوں لوگ اپنی جانیں گنوا بیٹھے۔ آئرش ریپبلکن آرمی (IRA) کے اہلکار ملک بھر میں پُرتشدد ہنگامے اور دہشت گرد کارروائیاں کر رہے تھے۔ اس دوران ایک انتہائی دل گداز واقع بھی رونما ہوا 1981ء میں جب شمالی آئرلینڈ کے حریت پسند اپنے مطالبات کے حق میں تادم مرگ بھوک ہڑتال پر تھے مگر مارگریٹ تھیچر نے اُن کے مطالبات کے ماننے سے صاف انکار کر دیا جس کے نتیجہ میں بوبی سینڈ (Boby Sand) سمیت 9 بھوک ہڑتالی حریت پسند موت کی نیند سو گئے۔ اپنے ساتھیوں کا بدلہ لینے کے لئے آئرش ریپبلکن آرمی کے جوانوں نے 12/اکتوبر 1984ء

کو مارگریٹ تھیچر پر زبردست قاتلانہ حملہ کیا جس میں مارگریٹ تھیچر کے پانچ ساتھی ہلاک ہو گئے مگر مارگریٹ تھیچر معجزانہ طور پر بچ گئیں۔ 15 اکتوبر 1985ء کو مارگریٹ تھیچر نے شمالی آئرلینڈ کے لیڈروں سے اینگلو آئرش ایگریمنٹ (Anglo-Irish Agreement) کر لیا جس کے تحت ریپبلک آف آئرلینڈ کو حکومت میں ایڈوائزری رول دے دیا گیا مگر شمالی آئرلینڈ کے عوام نے اس ایگریمنٹ کو مسترد کر دیا اور بلفاسٹ میں ایک لاکھ افراد نے احتجاجی ریلی نکالی۔ 1979ء میں سوویت یونین کی طرف سے افغانستان میں فوجی مداخلت پر مارگریٹ تھیچر نے شدید مخالفانہ مہم شروع کر دیا اور امریکہ کے ساتھ مل کر سوویت یونین کو افغانستان سے نکال باہر کرنے کے لئے ہر ممکن اقدامات کئے۔ 2/اپریل 1982ء کو ارجنٹائن کی فوجی حکومت کی طرف سے برٹش کنٹرولڈ جزیرے ''فاک لینڈ'' اور جنوبی جارجیا پر فوج کشی پر زبردست جوابی فوجی کارروائی کی اور چند روز کی شدید جنگ کے بعد ارجنٹائن کو شکست سے دوچار کر دیا۔

1982ء میں مارگریٹ تھیچر نے عوامی جمہوریہ چین کا دورہ کیا اور ہانگ کانگ کے مستقبل کے حوالے سے چینی قیادت کے ساتھ مذاکرات کئے۔ مارگریٹ تھیچر پہلی برطانوی وزیراعظم تھیں جنہوں نے چین کا دورہ کیا۔

1983ء جب امریکی صدر رونلڈ ریگن کے حکم پر امریکی فوجوں نے گرینیڈا (Grenada) پر حملہ کیا تو مارگریٹ تھیچر نے اس پر شدید ردِعمل ظاہر کیا۔

مارگریٹ تھیچر انتہائی سخت گیر وزیراعظم تھیں اور اپنے رفقاء کی کارکردگی پر بھی سخت تنقید کرتی تھیں جس کے باعث بالآخر اُن کے ساتھیوں نے ان کے خلاف بغاوت کر دی۔ یکم نومبر 1990ء کو اُن کے انتہائی قریبی ساتھی وزیر خزانہ جعفری ہاؤ نے استعفیٰ دے دیا۔ 2 نومبر 1990ء کو مائیکل ہیسل ٹائن نے مارگریٹ تھیچر کی لیڈر شپ کو چیلنج کر دیا جس پر دل برداشتہ ہو کر مارگریٹ تھیچر نے اقتدار چھوڑ دیا تاہم اپریل 1992ء تک وہ بدستور پارلیمنٹ کی رکن رہیں۔

مارگریٹ تھیچر نے 8/اپریل 2013ء کو 87 برس کی عمر میں وفات پائی۔ اُن کے خاوند سر ڈینس تھیچر دس برس قبل 26 جون 2003ء میں وفات پا گئے تھے۔

اولف پام (Olof Palme)

اولف پام سویڈن کے ایک انتہائی مقبول عوامی لیڈر تھے اور سویڈش سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے سربراہ تھے۔ عوامی مقبولیت کی بنیاد پر وہ دو مرتبہ سویڈن کے وزیراعظم منتخب ہوئے اور 1969ء

سے 1976ء تک اور پھر 1982ء سے 1986ء تک وزارت عظمیٰ پر فائز رہے۔ بطور وزیر اعظم ہی وہ قتل ہو گئے۔ اولف پام 2 فروری 1986ء کو اپنی اہلیہ کے ہمراہ گھر جاتے ہوئے راستے میں قتل کر دیئے گئے۔ اولف پام تھرڈ ورلڈ لبریشن موومنٹ کے سرگرم رکن تھے۔ انقلابی نظریات کے حامل تھے اور دنیا میں سپر پاورز کی اجارہ داری کے سخت مخالف تھے۔ سویڈن کے عوام آج بھی اولف پام کو ایک ہیرو کے طور پر یادر کھتے ہیں۔ اولف پام سویڈن کی تاریخ میں وہ واحد سیاسی قائد ہیں جو قتل کیئے گئے۔

رابرٹ میگابے (Robert Mugabe)

رابرٹ میگابے افریقی ملک زمبابوے کے انقلابی لیڈر ہیں اور زمبابوے کی برطانوی تسلط سے آزادی کے بعد سے اب تک زمبابوے کے طاقتور حکمران ہیں۔ زمبابوے جس کا سابقہ نام روڈلیشیا تھا کو انتہائی خونی جدوجہد کے نتیجے میں 1980ء میں آزادی نصیب ہوئی۔ رابرٹ میگابے نے افریقن نیشنل یونین کے سربراہ اور پڑیاٹک فرنٹ کے مرکزی لیڈر کے طور پر روڈیشیا (Raodesia) کی سفید فام حکومت کے خلاف جنگ آزادی میں زبردست کردار ادا کیا اور اس جنگ کے دوران وہ 1964ء سے 1974ء تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے رہے۔ قید سے رہائی پر وہ روڈیشیا سے موزمبیق منتقل ہو گئے۔ 1979ء میں رابرٹ میگابے واپس روڈیشیا آئے تو عوام نے ایک ہیرو کے طور پر اُن کا والہانہ استقبال کیا۔ رابرٹ میگابے کی سفید فام حکومت کے خلاف اپنی جدوجہد میں مزید شدت پیدا کر دی جس کے نتیجے میں اپریل 1980ء کو برطانوی راج کا خاتمہ ہو گیا اور زمبابوے کے نام سے ایک نئے آزاد ملک کا قیام عمل میں آیا۔ رابرٹ میگابے 1980ء میں آزاد مملکت کے وزیر اعظم مقرر ہوئے اور 1987ء تک وزیر اعظم رہے۔ 1987ء میں وہ زمبابوے کے صدر منتخب ہو گئے اور اب تک وہ بدستور صدر مملکت ہیں۔ 2013ء میں رابرٹ میگابے ساتویں مرتبہ زمبابوے کے صدر منتخب ہو گئے۔

ڈاکٹر مہاتیر محمد (Dr. Mahathir Muhammad)

ڈاکٹر مہاتیر محمد ملائیشیا کے ایک عظیم لیڈر ہیں جو مسلسل 22 برس تک ملائیشیا کے انتہائی مقبول منتخب وزیر اعظم رہے اور پانچ مرتبہ عام انتخابات کے ذریعے کامیاب ہوئے اور اپنے دور اقتدار میں انہوں نے اپنے ملک کو دنیا کا ایک جدید ترین، ترقی یافتہ اور اقتصادی طور پر انتہائی مضبوط بنا دیا۔ ڈاکٹر مہاتیر محمد پیشہ کے اعتبار سے ایک میڈیکل ڈاکٹر ہیں مگر زمانہ طالب علمی سے ہی وہ سیاست کے

میدان میں انتہائی سرگرم رہے۔ ڈاکٹر مہاتیر محمد 10 جولائی 1925ء کو پیدا ہوئے۔ 1964ء میں وہ پہلی مرتبہ پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے تاہم 1969ء کے عام انتخابات میں وہ اپنی سیٹ ہار گئیں 1973ء میں وہ سینیٹر منتخب ہو گئے۔ 1974ء کے انتخابات میں وہ اپنی کھوئی ہوئی سیٹ جیتنے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی برس انہیں وزیر تعلیم بنا دیا گیا۔ 5 مارچ 1976ء کو ڈاکٹر مہاتیر محمد کو ڈپٹی وزیراعظم منتخب کر لیا گیا۔ 16 جوائی 1981ء کو وہ ملائیشیا کے وزیراعظم منتخب ہو گئے۔ وزیراعظم کا عہدہ سنبھالتے وقت ڈاکٹر مہاتیر محمد کی عمر 56 برس تھی۔ پھر آئندہ 22 برس تک یعنی 31 اکتوبر 2003ء تک وہ مسلسل وزیراعظم کے عہدہ پر فائز رہے۔ 2002ء میں ڈاکٹر مہاتیر محمد نے اپنی سیاسی جماعت کی جنرل اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ جلد مستعفی ہو جائیں گے۔ 31 اکتوبر 2003ء کو انہوں نے وزارت عظمیٰ چھوڑ دی۔ ان کی جماعت کے سینئر لیڈر عبداللہ بداوی نے اُن کی جگہ وزارت عظمیٰ کا قلمدان سنبھال لیا۔ ڈاکٹر مہاتیر محمد ابھی حیات ہیں اور اُن کی عمر اب 89 برس ہے۔

یوں تو اور بھی بہت سے لیڈرز ہیں جنہوں نے بیسویں صدی میں اپنے اپنے ملک کے لئے گراں قدر خدمات سرانجام دیں اور جن کا ذکر دنیا کی تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ موجود رہے گا مگر اُن کے نظریات، سیاست اور طرز حکومت کے حوالے سے بہت سے متنازعہ معاملات اُن کے کردار پر سوالیہ نشانات مرتب کر چکے ہیں۔ ان لیڈروں میں دوسری جنگ عظیم کے بعد پہلے جرمن چانسلر Konrad Adenauer جو 1949ء سے 1963ء تک حکمران رہے۔ جاپان کے وزیراعظم Shigeru Yoshida جو 22 مئی 1946ء سے 24 مئی 1947ء اور پھر 15/اکتوبر 1948ء سے 1954ء تک وزیراعظم رہے۔ آسٹریلیا کے بارہویں وزیراعظم Robert Menzies جو 26 اپریل 1939ء سے 29 اگست 1941ء اور پھر 19 دسمبر 1949ء سے 26 جنوری 1966ء تک وزیراعظم رہے۔ فلپائن کے صدر Magsaysay جو 30 دسمبر 1953ء سے 17 مارچ 1957ء تک صدر رہے اور ایک فضائی حادثہ میں جان بحق ہو گئے۔ لیبیا کے لیڈر کرنل معمر قذافی جو یکم ستمبر 1969ء کے فوجی انقلاب کے نتیجے میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد 23 اگست 2011ء یعنی 42 برس مسلسل لیبیا کے سیاہ وسفید کے مالک رہے اور 20 اکتوبر 2011ء کو قتل کر دیئے گئے۔ عراق کے صدر صدام حسین جو 17 جولائی 1968ء سے 19 اپریل 2003ء تک بلاشرکت غیرے عراق پر حکمرانی کرتے رہے اور اقتدار سے جبری طور پر الگ کئے جانے کے بعد 30 دسمبر 2006ء کو تختہ دار

پر لٹکا دیئے گئے۔شام کے لیڈر حافظ الاسد جو عملاً 1966ء سے شام پر مکمل حکمرانی کرنے لگے مگر بظاہر 21 نومبر 1970ء کو وزیراعظم بن گئے اور پھر 3/اپریل 1971ء سے لے کر اپنی وفات یعنی 10 جون 2000ء تک شام کے مطلق العنان صدر رہے۔شیخ مجیب الرحمٰن جنہیں پاکستان کے عوام غدار اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا مجرم تصور کرتے ہیں بنگلہ دیش کے عوام کی نظروں میں ایک ہیرو کا درجہ رکھتے ہیں جو 12 جنوری 1972ء سے 24 جنوری 1975ء تک بنگلہ دیش کے وزیراعظم اور 25 جنوری 1975ء سے 15 اگست 1975ء تک بنگلہ دیش کے صدر رہے مگر 15 اگست 1975ء کو اپنے خلاف فوجی بغاوت کے نتیجہ میں اپنے خاندان کے دیگر افراد کے ہمراہ قتل کر دیئے گئے، شامل ہیں۔

میں نے اس کتاب مین جن قائدین کا ذکر کیا ہے اور ان کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں۔میرے قارئین میرے خیالات سے اتفاق یا اختلاف کر سکتے ہیں اور ممکن ہے ان کی نظر میں ایسے قائدین بھی موجود ہوں جن کا ذکر اس کتاب میں کرنا ضروری تھا جو میری کم علمی کے باعث میری تحریر کا حصہ نہیں بن سکے۔فیصلہ بہر صورت قارئین کے اختیار میں ہے۔

آخر میں یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنے طور رزیر نظر کتاب میں شامل قارئین کے درمیان کسی سم کی تفریق نہیں کی اور نہ ہی کسی ایک لیڈر کو کسی دوسرے لیڈر پر ترجیح دی ہے بلکہ کتاب کے صفحات پر ان کا ذکر اردو زبان کے حروف تہجی کی بنیاد پر متعلقہ ممالک کے ناموں کے اعتبار سے ترتیب وار شائع کیا ہے تا کہ قارئین مطالعہ کے دوران کسی قسم کا تعصب کا شبہ محسوس نہ کریں۔

سیّد سجاد بخاری

لاہور اکتوبر 2014ء

احمد بن بیلا

AHMED BEN BELLA

الجزائر کی آزادی کے ہیرو

شمالی افریقہ کے اہم اسلامی ملک الجزائر کو سامراجی قوتوں سے آزادی دلوا کر عوامی جمہوریہ الجزائر کے نام ایک عظیم مملکت کا تشخص دینے والے قائد کا نام احمد بن بیلا ہے۔ الجزائر جو رقبہ کے اعتبار سے بحر روم پر واقع براعظم افریقہ میں سوڈان کے بعد دوسرا بڑا اور دنیا کا گیارواں ملک ہے پر 1830ء میں فرانسیسی حکومت نے قبضہ کر لیا اور 1962ء تک الجزائر کے مسلمانوں کو زیر تسلط رکھا۔ الجزائر کے مسلمانوں نے فرانسیسی تسلط سے آزادی کے لئے جدوجہد میں ناقابل بیان ظلم و بربریت کا سامنا کیا اور بے شمار انسانی جانوں کی قربانی پیش کی۔ الجزائر پر فرانس کے 132 سال کے جبری تسلط کے دوران لاتعداد فرانسیسی خاندان الجزائر میں جا کر آباد ہو گئے اور انہوں نے الجزائر کو اپنا مستقل مسکن تصور کر لیا بلکہ الجزائر کو اپنے الگ نام سے پکارنے کی بجائے فرانسیسیوں نے اس ملک کو فرانسیسی الجزائر کا نام دے دیا۔ فرانسیسی ہر قیمت پر الجزائر کو اپنے قبضہ میں رکھنا چاہتے تھے اور اس مقصد کے لئے انہوں نے جبر و تشدد کی تمام حدیں پار کر لیں مگر الجزائر کے مسلمانوں نے احمد بن بیلا کی قیادت میں آگ اور خون کے دریا عبور کر کے بالآخر آزادی کی منزل حاصل کر لی۔ 1954ء سے 1962ء کے دوران لڑی جانے والی اس آزادی کی جنگ میں ایک لاکھ سے زائد الجزائری حریت پسند اور دس ہزار سے زائد فرانسیسی فوجی اپنی زندگی گنوا بیٹھے۔

احمد بن بیلا 25 دسمبر 1918ء کو الجزائر کے ایک چھوٹے سے گاؤں ماگنیا (Maghnia) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے لئے وہ اپنے علاقے ایک سکول میں داخل ہوئے لیکن تعلیم کے



دوران انہیں مسلمان ہونے کے ناطے ایک عیسائی استاد کے تعصب کا شکار ہونا پڑا اور انہیں سکول سے نکال دیا گیا۔ 1936ء میں احمد بن بیلا نے فرانسیسی فوج میں بطور رضا کار شمولیت اختیار کر لی لیکن غلام ملک کے شہری ہونے کے ناطے فوج میں احمد بن بیلا کے لئے ترقی کے راستے مسدود تھے۔ بن بیلا کے بڑے بھائی نے بھی فرانسیسی فوج میں خدمات سرانجام دیں اور پہلی جنگ عظیم میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ احمد بن بیلا کے دیگر دو بھائی بھی جواں عمری میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ 1940ء کے بعد احمد بن بیلا نے مراکش انفینٹری Moroccan Infantiry کی ایک رجمنٹ میں شمولیت اختیار کر لی جہاں انہیں وارنٹ آفیسر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔ اپنی بہترین خدمات پر انہیں تمغۂ جرأت سے بھی نوازا گیا۔ مگر 1945ء میں الجزائر کے مسلمانوں کے ساتھ فرانسیسی فوج کے ناروا سلوک کے باعث انہوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ کے لئے جدوجہد کرنے والی ایک خفیہ تنظیم کے رکن بن گئے۔ جو بعدازاں نیشنل لبریشن فرنٹ کے نام سے منظر عام پر آ گئی۔ 1951ء میں احمد بن بیلا کو گرفتار کر لیا گیا اور انہیں آٹھ سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ احمد بن بیلا جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور پہلے تیونس اور بعدازاں مصر چلے گئے۔ مصر میں قیام کے دوران انہیں انقلابی لیڈر جمال عبدالناصر سے قربت کا موقع ملا۔ 1954ء میں الجزائر کی جنگ آزادی کا جب باضابطہ آغاز ہوا اس وقت احمد بن بیلا مصر کے دارالحکومت قاہرہ میں موجود تھے مگر وہ (Revolutionary Committee of Unity and Action) کے 9 ممبران میں سے ایک تھے جو نیشنل لبریشن فرنٹ کے ذریعے جنگ آزادی کی قیادت کر رہے تھے۔ 1956ء میں انہیں ایک فضائی سفر کے دوران فرانسیسی جہازوں کی مدد سے زبردستی فرانس اتار کر گرفتار کر لیا گیا اور 1962ء تک پابند سلاسل رکھا گیا۔ دوران اسیری ہی انہیں الجزائر کی آزاد عبوری حکومت کا نائب وزیراعظم مقرر کر دیا گیا۔ احمد بن بیلا نے اپنی قید کے دوران عربی زبان سیکھ لی۔ احمد بن بیلا کو اگرچہ فرانسیسی زبان پر عبور حاصل تھا مگر اپنے ملک پر ناجائز طور پر مسلط فرانسیسی حکمرانوں سے نفرت کے باعث انہوں نے فرانسیسی کی بجائے عربی زبان اپنائی بلکہ اپنی بیٹی کو بھی فرانسیسی کی بجائے عربی زبان میں تعلیم دلوائی۔ احمد بن بیلا مصر کے صدر جمال عبدالناصر سے بے حد متاثر تھے اور اپنے آپ کو ان کا پیروکار کہتے تھے۔ الجزائر سے آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد بھی وہ صدر ناصر کے زبردست حامیوں اور مداحوں میں سے ایک تھے جس کے باعث انہیں مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔



بن بیلہ امریکہ کے صدر جان ایف کینیڈی کے ساتھ



الجزائر کی آزادی کی جدوجہد میں احمد بن بیلا کو حکومت پاکستان کی زبردست حمایت حاصل رہی اور پاکستان کی طرف سے انہیں غیر ملکی سفر کی سہولت کے لئے ڈپلومیٹک پاسپورٹ جاری کیا گیا 1980ء میں بھی الجزائر سے جلاوطنی کے وقت انہوں نے پاکستانی پاسپورٹ کے ساتھ ہی سفر کیا۔

1962ء میں الجزائر کی آزادی کے اعلان پر احمد بن بیلا کی شہرت آسمان کو چھونے لگی اور اُن کی عوامی حمایت میں زبردست اضافہ ہوگیا اور فوج میں بھی انہیں خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوگئی۔

ستمبر 1962ء تک احمد بن بیلا نے الجزائر کے تمام علاقوں پر عملاً کنٹرول حاصل کرلیا اور 20/ستمبر 1962ء کو ہونے والے انتخابات میں کامیابی حاصل کرتے ہوئے وزیراعظم بن گئے۔ 29/ستمبر 1962ء کو اقوام متحدہ نے احمد بن بیلا کو الجزائر کا منتخب حکمران تسلیم کرلیا اور الجزائر کو بطور آزاد مملکت کے 8/اکتوبر 1962ء کو اقوام متحدہ کا 109 واں رکن بنالیا۔

1963ء میں احمد بن بیلا الجزائر کے بلا مقابلہ صدر منتخب ہو گئے۔ احمد بن بیلا نے الجزائر کو ایک خوشحال، ترقی یافتہ اور دفاعی لحاظ سے طاقتور ملک بنانے کے لئے مختصر وقت میں متعدد انقلابی اصلاحات متعارف کروائیں۔

19 جون 1965ء کو احمد بن بیلا کو ان کے اپنے بنائے ہوئے وزیر دفاع اور دیرینہ ساتھی حواری بومدین جنہیں سوشلسٹ نیشنلسٹس اور فوج کی حمایت حاصل تھی نے ایک فوجی بغاوت کے ذریعے عہدہ صدارت سے برطرف کر کے قید کر دیا۔ بن بیلا پر الزام عائد کیا گیا کہ انہوں نے ملک میں آمریت کر رکھی تھی اور وہ اندرون ملک اہم معاملات پر توجہ دینے کی بجائے خارجہ امور میں مگن رہتے تھے۔ حواری بومدین 1978ء تک الجزائر کے سیاہ وسفید کے مالک بنے رہے اور احمد بن بیلا مسلسل زیر حراست رہے۔ 1978ء میں حواری بومدین اگرچہ وفات پا گئے مگر احمد بن بیلا کو رہائی 1980ء سے پہلے نصیب نہ ہوسکی۔

احمد بن بیلا کو اپنی انقلابی جدوجہد پر سوویت یونین کی حکومت نے 30/اپریل 1964ء کو Hero of the Soviet Union کا ایوارڈ دیا۔

1980ء میں رہائی کے بعد احمد بن بیلا کو سوئٹزرلینڈ میں جلاوطنی کی زندگی گزارنا پڑی جو 10 سال پر محیط تھی تاہم 1990ء میں انہیں واپس اپنے وطن آنے کی اجازت مل گئی۔

احمد بن بیلا کو قاہرہ کانفرنس میں عراق پر جارحیت کے خلاف بین الاقوامی مہم کا صدر منتخب کرلیا گیا اور وہ ماضی قریب تک وہ افریقن یونین پینل کے صدر بھی رہے۔

احمد بن بیلا اپنی زندگی کے اختتام تک سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے رہے۔ وہ الجزائر میں مروجہ یک جماعتی نظام کے خلاف آواز اٹھاتے رہے۔ وہ اپنے ملک میں مکمل جمہوریت دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ اگرچہ احمد بن بیلا کی شخصیت اور افکار کے بارے میں بہت سے لوگ متضاد خیالات رکھتے ہیں مگر پوری دنیا میں انہیں نوآبادیاتی اور سامراجی نظام کے خلاف عظیم جدوجہد کرنے والے ہیرو کے طور پر تحسین کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور عرب دنیا میں احمد بن بیلا کو ایک پُرجوش اور حقیقی عرب قوم پرست کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔

فروری 2012ء میں احمد بن بیلا کو میڈیکل چیک اَپ کے لئے ہسپتال داخل کروایا گیا۔ اس دوران پورے ملک میں افواہ پھیل گئی کہ احمد بن بیلا اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ہیں تاہم اُن کے خاندان نے اُن کی وفات کی تردید کر دی۔

11 اپریل 2012ء کو احمد بن بیلا الجزائر میں واقع اپنے آبائی گھر میں وفات پا گئے۔ وفات کے وقت اُن کی عمر 94 برس تھی۔ 12 اپریل کو بن بیلا کا جسد خاکی دیدار عام کے لئے رکھا گیا جبکہ 13 اپریل کو اُن کی باضابطہ تدفین کر دی گئی۔ الجزائر کی حکومت نے احمد بن بیلا کی قومی خدمات کے اعتراف میں اُن کی وفات پر قومی سطح پر آٹھ روزہ سوگ کا اعلان کیا۔

فرینکلن روز ویلٹ

(FRANCLIN ROOSEVELT)

فرینکلن روز ویلٹ امریکہ کی تاریخ کے واحد لیڈر ہیں جنہوں نے چار مرتبہ امریکی صدارت کا الیکشن لڑا اور چاروں مرتبہ واضح اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔ مسلسل چار مرتبہ نہ صرف انہوں نے امریکی صدر کی حیثیت سے اپنے عہدہ کا حلف اٹھایا بلکہ اپنے حلف کی پاسداری بھی بھرپور طریقے سے کی اور امریکی قوم کو تاریخ کے بدترین حالات اور مشکلات سے نکال کر روشن مستقبل سے ہمکنار کر دیا۔ 39 برس کی عمر میں پولیو کے شدید حملے نے انہیں کسی حد تک جسمانی طور پر مفلوج کر دیا مگر وہ ذہنی طور پر کبھی مفلوج نہیں ہوئے اور دوسری جنگ عظیم کے طویل اور تباہ کن حادثات و واقعات بھی ان کے حوصلے اور استقامت کو کم نہ کر سکے۔ فرینکلن روز ویلٹ امریکی تاریخ کے 32 ویں صدر تھے اور 1932ء میں ہی انہوں نے پہلی مرتبہ صدارتی انتخاب جیتا۔ دوسرا صدارتی الیکشن 1936ء، تیسرا 1940ء اور چوتھا الیکشن انہوں نے 1944ء میں جیتا۔ زندگی میں انہیں کبھی کوئی شکست نہیں دے سکا مگر 12/اپریل 1945ء کو صدارتی محل میں ہوتے بھی موت نے انہیں مکمل شکست سے دوچار کر دیا مگر موت بھی ان کا یہ اعزاز نہ چھین سکی کہ وہ پندرہ برس تک مسلسل ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے منتخب صدر رہے۔

30/اپریل 1787ء کو امریکی عہدہ صدارت سنبھالنے والے پہلے لیڈر، امریکہ کی آزادی کے ہیرو جارج واشنگٹن نے دو مرتبہ امریکی صدارت کا انتخاب جیتنے کے بعد تیسری مرتبہ کے لئے صدارتی انتخاب لڑنے سے انکار کر دیا تھا اور اس کے بعد امریکہ میں یہ روایت قائم ہو گئی تھی کہ امریکہ میں کوئی بھی صدارتی امیدوار تیسری مرتبہ انتخاب میں حصہ نہیں لے گا یہ روایت 1932ء تک فرینکلن روز ویلٹ کے انتخاب لڑنے تک قائم رہی۔ فرینکلن روز ویلٹ بھی شاید اس روایت پر



قائم رہتے اگر مروجہ حالات اس روایت کو توڑنے کے متقاضی نہ ہوتے۔ ہوا یہ کہ فرینکلن روز ویلٹ کے عہدۂ صدارت کی مدت ختم ہونے سے قبل یکم ستمبر 1939ء کو جرمنی کی طرف سے پولینڈ پر باضابطہ حملہ کے ساتھ ہی دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ 1940ء میں امریکہ میں صدارتی انتخاب ہونا تھا۔ روایت کے مطابق روز ویلٹ تیسری مرتبہ کے لئے صدارتی انتخاب نہیں لڑ سکتے تھے مگر امریکی عوام نہیں چاہتے تھے کہ جنگ عظیم کے دوران وہ کسی نئے صدر کا انتخاب کریں لہٰذا روز ویلٹ کو قائل کرلیا گیا کہ وہ روایت سے ہٹ کر تیسری مرتبہ بھی صدارتی امیدوار رہیں۔ انہوں نے تیسری مرتبہ بھی صدارتی انتخاب لڑا اور آسانی کے ساتھ کامیابی حاصل کر لی۔ 1944ء میں جب نئے صدارتی انتخاب کا مرحلہ آیا تو صورت حالات بدستور وہی تھی یعنی دوسری جنگ عظیم ابھی جاری تھی اور امریکی عوام جنگ کے دوران اپنا لیڈر تبدیل نہیں کرنا چاہتے تھے لہٰذا ایک بار پھر فرینکلن روز ویلٹ کو ہی صدارتی انتخاب میں حصہ لینا پڑا جس میں انہیں ایک بار پھر آسانی کے ساتھ کامیابی مل گئی۔ 1945ء میں روز ویلٹ کی وفات کے بعد دستور کے مطابق ان کے نائب صدر ٹرومین (Truman) نے ان کی باقی ماندہ صدارت کی مدت پوری کی۔ روز ویلٹ امریکی تاریخ کے چوتھے صدر تھے جو اپنی صدارت کی مدت کے دوران طبعی موت سے ہمکنار ہوئے۔ ان سے قبل ولیم ہنری ہیری سن (William Henry Harrison) (9ویں صدر) زیکری ٹیلر (Zachary Taylor) (12ویں صدر) اور وارن ہارڈنگ (Warren Harding) (29ویں صدر) اپنے عہدہ صدارت کے دوران وفات پا گئے تھے۔ فرینکلن روز ویلٹ امریکی تاریخ کے سب سے کم عمر میں منتخب ہونے والے نوبل انعام یافتہ صدر تھیوڈور روز ویلٹ (Theodore Roosevelt) (26ویں صدر) کے خاندان میں سے تھے اور ان کے پانچویں کزن (Fifth Cousun) شمار کئے جاتے تھے ان کی ایک بھتیجی آنا ایلینور (Anna Eleanor) فرینکلن روز ویلٹ کی بیوی تھیں۔

فرینکلن روز ویلٹ 13/جنوری 1882ء کو نیویارک کے ایک انتہائی امیر گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کا مکمل نام فرینکلن ڈیلانو روز ویلٹ (Franklin Delano Roosvelt) تھا۔ اُن کی ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر پرائیویٹ ٹیوٹرز کے ذریعے ہوئی اور 14 برس کی عمر تک وہ کسی تعلیمی ادارے میں داخل نہ ہوئے۔ بعدازاں وہ ایک پرائیویٹ اسکول میں کچھ عرصہ زیر تعلیم رہنے کے بعد ہاورڈ کالج میں داخل ہو گئے اور وہاں سے 1903ء میں انہوں نے گریجوایشن کا امتحان پاس کرلیا۔ روز ویلٹ نے 1904ء میں کولمبیا لاء سکول میں داخلہ لے لیا اور 1907ء میں انہیں بار ایٹ لاء کی ڈگر مل گئی۔ اس


وزیراعظم چرچل امریکی صدر روز ویلٹ اور سوویت یونین کے سربراہ جوزف سٹالن کے ساتھ



دوران 1905ء میں انہوں نے اپنی ایک کزن آنا ایلینور روز ویلٹ (Anna Eleanor Roosevelt) سے شادی کر لی جن سے ان کے چھ بچے پیدا ہوئے۔

فرینکلن روز ویلٹ نے 1910ء میں ڈیموکریٹک پارٹی کی ٹکٹ پر نیویارک سے سینٹ کا الیکشن جیت لیا اور 1913ء تک بطور سینیٹر خدمات سرانجام دیں۔ 1913ء میں انہوں نے امریکی بحریہ (Navy) میں بطور اسسٹنٹ سیکرٹری شمولیت اختیار کر لی اور 1921ء تک مختلف حیثیتوں میں کام کرتے ہوئے اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا منوالیا اور ایک بہترین ایڈمنسٹیٹر ہونے کی شہرت حاصل کر لی۔ اسی دوران 1920ء میں انہوں نے امریکہ کے صدارتی انتخابات میں صدارتی امیدوار جیمز ایم کاکس (James M Cox) کے ساتھ نائب صدر کے امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیا مگر دونوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور صدر کے طور پر وارن ہارڈ نگ اور نائب صدر کی حیثیت سے کیلون کولیج انتخاب جیت گئے۔

اگست 1921ء میں روز ویلٹ پولیو کے ایک شدید حملہ کی زد میں آ گئے جس سے ان کے بازو اور ٹانگیں جزوی طور پر مفلوج ہو گئیں۔ روز ویلٹ کی والدہ نے اصرار کیا کہ وہ سیاست سے ریٹائر ہو جائیں مگر اُن کی اہلیہ آنا ایلینورا اور ان کی سیکرٹری لوئس ہوو (Louis Howe) نے ان کا مکمل ساتھ دیا اور ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کی جس کے باعث وہ سیاست کے میدان میں سرگرم رہے۔ 1928ء میں فرینکلن روز ویلٹ نے نیویارک اسٹیٹ کی گورنر شپ کے لئے الیکشن لڑا اور بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔ 1930ء میں وہ دوبارہ نیویارک کے گورنر منتخب ہو گئے۔ 1932ء میں روز ویلٹ نے صدر ہربرٹ ہوور (Herbet Hoover) کے مقابلہ میں ڈیموکریٹک پارٹی کے امیدوار کے طور پر صدارتی الیکشن لڑا اور زبردست کامیابی حاصل کی۔ روز ویلٹ کی اس کامیابی میں اُن کی مقبولیت سے زیادہ موجودہ صدر ہربرٹ ہوور کی انتہائی ناکام پالیسیوں کا عمل دخل بھی تھا جس کے باعث پوری امریکی قوم مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں کی نذر ہو چکی تھی اور امریکی معیشت مکمل تباہی کے دھانے پر کھڑی تھی۔ روز ویلٹ نے قوم کو یقین دہانی کروائی کہ وہ قوم کو مایوسی کے اندھیروں سے باہر نکالیں گے۔ اس دور کو امریکہ کی تاریخ میں "گریٹ ڈیپریشن" (Great Depression) کا نام دیا جاتا ہے۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ امریکہ میں ایک کروڑ تیس لاکھ افراد بے روزگار ہو چکے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں کسان اور مزدور بے گھر ہو چکے تھے۔ روز ویلٹ نے 4/ مارچ 1933ء کو اپنے عہدے کا حلف اٹھانے کے صرف دو روز بعد ملک میں مالیاتی ایمرجنسی

کا اعلان کر دیا اور ''بنک ہالیڈے'' (Bank Holiday) کے نام سے تمام بنک بند کر دیئے گئے۔ انہوں نے وزارت خزانہ کو حکم دیا کہ وہ تمام بنکوں کے کھاتہ جات اور لین دین کی مکمل چھان بین کریں اور انہیں بحران سے نکالنے کے لئے ضروری اقدامات کریں۔ کچھ ہی دنوں کے اندر حالات میں بہتری آنے لگی اور جب بنک دوبارہ کھولے گئے تو بنکوں پر عوام کا اعتماد کسی حد تک بحال ہو چکا تھا۔ 6/ مارچ کو ہی ایوان نمائندگان (کانگرس) کا خصوصی اجلاس منعقد کیا گیا جس میں روز ویلٹ کی طرف سے ہنگامی قانون سازی کے اعلان کی منظور دے دی گئی۔ 12/ مارچ کو روز ویلٹ نے امریکی عریڈیو پر قوم سے خطاب کیا اور مستقبل کے لئے اپنی پالیسیوں کی وضاحت پیش کی۔ چار روز بعد روز ویلٹ نے کانگرس کی منظوری کے لئے اپنی تجاویز بھیجنا شروع کر دیں جن میں آئندہ ایک سو دنوں (Hundred Days) کے دوران ہنگامی بنیادوں پر کئے جانے والے مجوزہ اقدامات کا ذکر کیا گیا تھا۔ امریکی معیشت کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے اور عوام کو روزگار دینے کے لئے متعدد انقلابی اقدامات اٹھائے گئے۔ ان میں ''زرعی انتظامی ہم آہنگی'' (Agricultural Adjustment Administration) کا قیام تھا جس کا مقصد کسانوں کو اس بات پر آمادہ کرنا تھا کہ وہ قیمتوں میں استحکام پیدا کرنے کی غرض سے اجناس کی پیداوار میں کمی کریں۔ اس کے علاوہ نیشنل ریکوری ایڈمنسٹریشن (National Recovery Administration) کا قیام عمل میں لایا گیا جس نے قومی اداروں میں کام کرنے والے افراد کو کم سے کم اُجرت میں زیادہ سے زیادہ کام کرنے پر قائل کرنا تھا۔ اسی طرح نوجوانوں کو قومی بھلائی کے کاموں اور سماجی خدمات سرانجام دینے کے لئے سرگرم کرنے کی غرض سے بھی اہم اقدامات کئے گئے۔ روز ویلٹ نے کانگرس سے 1935ء کا میروف ویگنر ایکٹ (Wagner Act) بھی منظور کروایا جس کے تحت مزدوروں کی فلاح و بہبود کو یقینی بنانا، ٹیکس کے قانون میں اصلاحات کرنا شامل تھا۔ 1936ء میں سوشل سکیورٹی ایکٹ اور یوتھ ایڈمنسٹریشن ایکٹ کا نفاذ بھی عمل میں لایا گیا۔ ان اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ روز ویلٹ کی عوام میں مقبولیت بڑھ گئی اور وہ 1936ء کا صدارتی انتخاب بڑی آسانی سے اور واضح اکثریت کے ساتھ جیت گئے۔ 1933ء سے 1937ء تک امریکی معیشت میں کافی بہتری آئی مگر اقتصادی صورت حال مکمل طور پر کنٹرول میں نہ آسکی بلکہ کساد بازاری نے امریکی معیشت کو آن گھیرا اور روز ویلٹ کے بعض اہم اقدامات کو امریکی سپریم کورٹ نے کالعدم قرار دے دیا۔ روز ویلٹ جواباً سپریم کورٹ کے خلاف سخت اقدامات کرنے کا ارادہ رکھتے تھے مگر قدامت پسند کانگرس نے انہیں ایسا کرنے کی

اجازت نہ دی۔ دوسری جنگ عظیم نے البتہ امریکی معیشت کو زبردست سہارا دیا اور امریکی عوام کے روزمرہ کے معاملات میں بہتری آ گئی۔

1939ء میں جاپان کی طرف سے چین پر حملہ اور جرمنی کی جانب سے پولینڈ پر حملہ کے بعد روزویلٹ نے چین اور برطانیہ کو زبردست سفارتی اور مالی امداد فراہم کی لیکن بظاہر امریکہ جنگ میں غیر جانبدار رہا۔ مارچ 1941ء میں روزویلٹ نے کانگرس کی منظوری سے اُن تمام ملکوں کو خصوصی امداد فراہم کرنا شروع کر دی جو جرمنی کے خلاف جنگ میں ملوث ہو گئے تھے مگر 7/دسمبر 1941ء کو ''پرل ہاربور'' (Pearl Harbor) پر جاپان کے شدید حملہ جس میں امریکہ کا ناقابل تلافی جنگی نقصان ہوا کے بعد روزویلٹ نے امریکہ کی دوسری جنگ عظیم میں باقاعدہ شمولیت کا اعلان کر دیا اور جنگ میں فتح کے لئے تمام وسائل بروئے کار لانے کا فیصلہ کر لیا۔ ایٹم بم کی تیاری بھی اسی فیصلہ کے تحت ہوئی اور اسی فیصلہ کے تحت 1942ء میں روزویلٹ نے امریکہ میں مقیم ایک لاکھ جاپانیوں کو امریکہ سے نکال دیا جس سے امریکہ میں موجود بیروزگاری کی شرح فوراً دو فیصد کم ہو گئی۔ زیادہ تر ریلیف پروگرام ختم کر دیئے گئے جس سے صنعتی معیشت تیزی کے ساتھ بہتر ہونے لگی اور فوجی کیمپوں میں لاکھوں افراد کی بھرتی سے لوگوں کو روزگار حاصل ہو گیا۔ امریکی عوام میں بھی اس قدر قومی جذبہ بیدار ہوا کہ ایک کروڑ ساٹھ لاکھ مرد اور تین لاکھ عورتیں رضاکارانہ طور پر فوجی خدمات سرانجام دینے کے لئے فوجی کیمپوں میں شامل ہو گئیں۔

روزویلٹ نے امریکی سیاست میں بھی متعدد اصلاحات متعارف کروائیں۔ روزویلٹ نے امریکہ کی بیرونی ترقی اور سفارتی سطح پر امریکہ کے کردار کو نمایاں کرنے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا جو ان کی وفات کے طویل عرصہ بعد بھی لوگوں کے ذہنوں میں زندہ و تابندہ رہا۔

1944ء میں فرینکلن روزویلٹ کی صحت تیزی کے ساتھ گرنے لگی اور وہ اکثر شدید تھکن کا شکار نظر آئے۔ مارچ 1944ء میں انہیں ڈاکٹروں کی طرف سے اپنے مکمل ٹیسٹ کروانے کا مشورہ دیا گیا انہوں نے Betherdo Hospital سے ٹیسٹ کروائے تو ان کے نتائج انتہائی خوفناک نظر آئے۔ وہ لاتعداد بیماریوں کی زد میں تھے جن میں ہائی بلڈ پریشر اور دل کی تکلیف جیسی جان لیوا بیماریاں شامل تھیں۔ روزویلٹ 1944ء کے صدارتی انتخاب میں حصہ لینے کے زیادہ خواہشمند نہیں تھے مگر ان کی پارٹی ڈیموکریٹک پارٹی کے قائدین اور ووٹرز کی اکثریت چاہتی تھی کہ وہ چوتھی مرتبہ بھی صدارتی الیکشن لڑیں چنانچہ وہ اس پر آمادہ ہو گئے۔ 1944ء کے صدارتی انتخاب میں انہوں نے سینیٹر

صحت کے پیش نظر ان کی حلف برداری کی چوتھی تقریب وائٹ ہاؤس (White House) کے لان میں منعقد ہوئی۔

روز ویلٹ نے فروری 1945ء میں یالٹا کانفرنس (Yalta Conference) میں شرکت کی جس میں اتحادی ممالک کے سربراہان نے شرکت کی۔ اس موقع پر برطانیہ کے وزیر چرچل کے ذاتی ڈاکٹر نے روز ویلٹ کی صحت پر رائے زنی کرتے ہوئے کہا: He is a dying man۔

12 اپریل 1945ء کو روز ویلٹ کو کمر اور سر میں شدید درد محسوس ہوئی اور وہ بے ہوش ہو کر اپنی کرسی پر ہی لڑھک گئے۔ انہیں بے ہوشی کی حالت میں ہی ان کے بیڈروم میں لایا گیا جہاں ڈاکٹر ہاروڈ بروئن (Haward Bruenn) نے ان کا معائنہ کیا اور کہا کہ انہیں شدید ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ اسی شام تین بج کر پینتیس منٹ پر روز ویلٹ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

احمد سوئیکارنو

AHMED SUKARNO

انڈونیشیا کی آزادی کے ہیرو

احمد سوئیکارنو انڈونیشیا کے ایک عظیم لیڈر کے طور پر زندگی بھر اور وفات کے بعد بھی عوام کے دلوں اور ذہنوں پر راج کرتے رہے۔ سوئیکارنو نے اپنی قوم کو نیدرلینڈ جو دوسرے الفاظ میں ڈچ امپائر (Dutch Impire) بھی کہلاتی تھی کی غلامی سے آزاد کروایا اور پھر 22 برس تک سربراہ مملکت کے طور پر انڈونیشیا کو نہ صرف اندرونی طور پر مضبوط اور مستحکم ملک بنایا بلکہ بین الاقوامی برادری میں بھی خاص طور پر مسلم امہ میں انتہائی باوقار ملک کا درجہ دلوایا۔

احمد سوئیکارنو مشرقی جاوا (Java) کے شہر Surabaya میں 1901ء میں پیدا ہوئے۔ جاوا اور انڈونیشیا کے تمام علاقے اس وقت ڈچ کالونیکل کنٹرول Dutch Colonical Control میں تھے۔ سوئیکارنو کی پرورش اگرچہ روایتی جاوین ماحول میں ہوئی مگر انہوں نے تعلیم ڈچ کالونیکل سکولز میں حاصل کی۔ ان کے والد ایک سکول ٹیچر تھے۔

1921ء میں وہ بینڈ نگ انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی Bandung Institute of Technology میں داخل ہوئے اور آرکیٹیکچر Architecture کی تعلیم حاصل کی۔ احمد سوئیکارنو اپنی جواں عمری میں ہی قومی سیاست میں بھرپور حصہ لینے لگے اور انہوں نے اپنی تعلیم کے دوران ہی فیصلہ کر لیا وہ اپنا مستقبل آرکیٹیکچر کی بجائے سیاست سے وابستہ کریں گے۔

1926ء میں سوئیکارنو نے دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی Sitliutari سے اور اسے طلاق دینے کے بعد دوسری شادی Inggit Garnarih سے۔ بعدازاں انہوں نے مزید دو شادیاں



کیں۔ اگرچہ ان کا خیال تھا کہ اسلامی نقطۂ نظر سے وہ چار بیویاں رکھنے کا حق رکھتے ہیں مگر ان کے اس عمل سے انہیں انڈونیشیا میں سخت تنقید کا نشانہ بھی بننا پڑا۔ خاص طور پر خواتین تنظیموں کی طرف سے۔

1927ء میں احمد سوئیکارنو نے انڈونیشین نیشنل پارٹی (PNI) کی بنیاد رکھی اور اس کے پہلے سربراہ بنے۔ پارٹی کے قیام کا مقصد انڈونیشیا کو غیروں کے قبضہ سے چھڑا کر قوم کو آزادی دلوانا تھا۔ اپنی بہترین قائدانہ صلاحیتوں اور لاجواب مقرر ہونے کے باعث احمد سوئیکارنو بہت جلد عوامی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

1929ء میں ڈچ حکومت نے احمد سوئیکارنو کو گرفتار کر لیا اور دو سال کے لئے جیل میں ڈال دیا۔ ان کی غیر موجودگی میں ان کی سیاسی جماعت اپنی اہمیت اور مقبولیت کھو بیٹھی۔

1931ء میں رہائی کے بعد احمد سوئیکارنو نے پھر سے بھرپور سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا مگر انہیں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا مگر اس بار انہیں جیل میں بھیجنے کی بجائے ڈچ حکومت نے ملک بدر کر دیا۔ ان کی پہلی جلاوطنی فلورز Flores کے جزیرہ میں ہوئی اور بعد میں انہیں سوماترا Sumatra بھیج دیا گیا۔ جلاوطنی کے باعث عوام میں ان کی مقبولیت مزید بڑھ گئی اور وہ ایک قومی ہیرو کے طور پر مشہور ہو گئے۔

1942ء میں دوسری جنگ عظیم کے دوران جب جاپان نے انڈونیشیا پر قبضہ کر لیا تو سوئیکارنو جکارتہ واپس آ گئے اور جاپانی حکومت کے ساتھ تعاون کا راستہ اپنایا۔ اس عمل سے ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ گفت و شنید کے ذریعے اپنے ملک کو جاپان کے قبضہ سے آزاد کروا لیں۔ احمد سوئیکارنو کا یہ حربہ کافی حد تک کامیاب رہا اور جاپانی حکومت بغیر کسی خون خرابے کے انڈونیشیا کو آزاد کرنے پر رضامند ہو گئی۔

1944ء میں جاپانی حکومت کی طرف سے انڈونیشیا کی آزادی کے حوالے سے ایک کمیٹی قائم کی گئی۔ اس کمیٹی میں سرکردہ حیثیت احمد سوئیکارنو کو حاصل تھی۔

یکم جولائی 1945ء کو کمیٹی کے سامنے نئی آزاد مملکت کی بنیاد کے لئے 5 اصول پیش کئے گئے جو مندرجہ ذیل تھے۔

1- نیشنلزم (Nationalism)

2- انٹرنیشنلزم (Internationalism)



احمد سوئیکارنو مسلح افواج سے سلامی لیتے ہوئے



صدر سوئیکارنو امریکی صدر جان ایف کینیڈی کے ساتھ

-3 جمہوریت (Democracy)

-4 سماجی انصاف (Social Justice)

-5 اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتقاد (Beleef in God)

17/اگست 1945ء کو دوسری جنگ عظیم کے اختتامی مرحلہ پر اتحادی فوجوں کے سامنے جاپانی فوجوں کے ہتھیار ڈالنے کے ساتھ ہی احمد سوئیکارنو اور قوم پرست راہنما محمد ہاتا (Mohammad Hatta) نے انڈونیشیا کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اگلے ہی روز عبوری پارلیمنٹ نے ایک آئین کی منظور دے کر احمد سوئیکارنو کو صدر مملکت منتخب کر لیا۔ اس آئین کے تحت صدر سوئیکارنو کو لاحدود اختیارات دے دیئے گئے۔ ڈچ حکومت نے انڈونیشیا کی آزادی کے اعلان کو مسترد کر دیا۔ اگلے پانچ برس تک انڈونیشیا اور نیدرلینڈ (ڈچ) کے درمیان زبردست محاذ آرائی جاری رہی تاہم گاہے بگاہے مذاکرات بھی ہوتے رہے بالآخر دسمبر 1949ء میں ڈچ حکومت نے انڈونیشیا کی آزادی کو تسلیم کر لیا لیکن صوبہ پاپوا (Papua) کی ملکیت کے بارے میں تنازعہ برقرار رہا۔ اگرچہ صدر سوئیکارنو ڈچ حکومت کے خلاف جدوجہد کرنے حوالے سے ایک قومی ہیرو کے طور پر عوام کے پسندیدہ لیڈر رہے مگر اندرون ملک کچھ حلقے انہیں سخت تنقید کا نشانہ بھی بناتے رہے۔ 1949ء کے بعد بننے والے انڈونیشیا کے نئے آئین میں پارلیمانی نظام کے نفاذ کو یقینی بنایا گیا جس سے صدر سوئیکارنو کے اختیارات کم ہو گئے اور زیادہ تر اختیارات وزیراعظم کے پاس چلے گئے صدر سوئیکارنو اس صورت حالت سے مطمئن نہ تھے۔ اس کے نتیجہ میں سیاسی نظام کا استحکام خطرے میں پڑ گیا اور فوج کے اندر سوماترا (Sumatra) اور سولاویسی (Sulawesi) میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ ان حالات کے پیش نظر 1957ء کے بعد صدر سوئیکارنو نے اپنے آپ کو زیادہ بااختیار اور طاقتور بنانے کا فیصلہ کیا۔ 1959ء میں انہوں نے حکم دیا کہ 1945ء کے آئین کا ازسرنو جائزہ لیا جائے اور اُسے ملک اور قوم کی ضرورتوں کے مطابق مرتب کیا جائے۔ نئے آئین میں صدر کو بہت زیادہ اختیارات کا مالک بنا دیا گیا۔ صدر سوئیکارنو کا مؤقف تھا کہ مغربی طرز کی جمہوریت انڈونیشیا کی ضرورت کے مطابق نہیں ہے۔ صدر سوئیکارنو نے مغربی طرز کی جمہوریت کی بجائے گائیڈڈ جمہوریت (Guided Democracy) کا نظام متعارف کروایا جس مین یہ قرار دیا گیا کہ فیصلہ سازی کے لئے ووٹوں کی اکثریت کو مدنظر رکھنے کی بجائے باہمی مشاورت اور اتفاق رائے کا اصول اپنایا جائے۔ صدر سوئیکارنو نے تین بنیادی نکات کو قومی اتحاد کے لئے بنیاد قرار دیا۔ یہ تین اصول

نیشنلزم، مذہب اسلام اور کمیونزم۔ صدر سوئیکارنو کے ان اقدامات کی اکثر سیاسی جماعتوں نے شدید مخالفت کی تاہم صدر سوئیکارنو نے اپنی مخالف تمام جماعتوں پر پابندی عائد کر دی اور ان جماعتوں کے رہنماؤں کو جیلوں میں ڈال دیا۔ نئے نظام کو انڈونیشین کمیونسٹ پارٹی (PKI) نے بہت سراہا اور اس کا بھرپور خیر مقدم کیا۔ صدر سوئیکارنو خود بھی کمیونسٹ نظریات کے حامی بن گئے۔ اس ماحول میں فوج نے بھی اپنے آپ کو منظّم اور طاقتور بنا لیا درحقیقت فوج صدارتی اختیارات اور کمیونزم کے خلاف ایک قوت کے طور پر سامنے آ گئی۔ صدر سوئیکارنو کی اقتصادی معاملات پر گرفت نہ ہونے کے برابر تھی اور گائیڈڈ ڈیموکریسی میں انڈونیشیا کی اقتصادی حالت روز بروز کمزور ہونے لگی۔ بیرونی قرضہ جات بڑھنے لگے۔ زراعت، مائننگ (Mininng) ٹرانسپورٹیشن اور بینکنگ (Banking) کے شعبہ سے منسلک قومی کمپنیاں شدید خسارے کی نذر ہو گئیں۔ 1965ء تک انڈونیشیا میں افراط زر کی شرح سالانہ 650 فیصد ہو گئی اور انڈونیشیا کی اکانومی تباہی کے دھانے پر پہنچ گئی۔ مگر ان تمام حالات کے باوجود صدر سوئیکارنو کی عوام میں مقبولیت میں کمی نہ آئی۔ انہوں نے قوم کے اندر یہ جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ انڈونیشی قوم ہونے پر فخر کرتے تھے اور سوئیکارنو کو اپنا قومی ہیرو مانتے تھے۔ صدر سوئیکارنو کو بطور خاص غریب کسانوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی زبردست حمایت حاصل تھی۔ صدر سوئیکارنو کو انڈونیشیا میں رہائش پذیر چینی (Chinese) لوگوں کی بھی حمایت حاصل تھی جنہیں انہوں نے شہریت کے مکمل حقوق عطا کیے تھے۔ تاہم اپنی صدارت کے آخری سالوں میں انہوں نے کمیونسٹ پارٹی اور انڈونیشی فوج پر مکمل انحصار کیا۔ 1950ء میں انہوں نے چین کے ساتھ گہرے مراسم قائم کر لئے تھے اور اپنی حکومت میں کمیونسٹ نظریات کے حامل افراد کو زیادہ اہم عہدوں پر فائز کیا۔ سوویت یونین سے تعلقات کو وسیع کیا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ ایشین ممالک کے ساتھ اتحاد بنانے کی طرف مائل ہو گئے اور انہوں نے چین اور شمالی کوریا سے قربت زیادہ بڑھا لی۔ 1961ء میں صدر سوئیکارنو ''غیر جانبدار تحریک'' کے رکن بھی بن گئے بعدازاں انہوں نے مصر کے صدر جمال عبدالناصر، گھانا کے صدر نکروما، ہندوستان کے وزیراعظم جواہر لعل نہرو اور یوگوسلاویہ کے صدر مارشل ٹیٹو کے ساتھ مل کر ایک الگ بلاک بھی بنایا جسے (The Intiative of Five) کا نام دیا گیا۔ اس موومنٹ کا مقصد یہ تھا کہ دونوں سپر پاورز یعنی سوویت یونین اور یونائیٹڈ سٹیٹس آف امریکہ جو کہ سرد جنگ (Cold war) میں ملوث تھیں میں سے کسی کو بھی فیور (Favour) نہ کیا جائے۔ 1955ء میں منعقد ہونے والی Bandung Conference کا بنیادی ایجنڈا یہی تھا کہ

دونوں عالمی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ترقی پذیر ایشیائی اور افریکی ممالک کو متحد کیا جائے انڈونیشیا کو ایشیائی ملکوں کی صف میں اہم مقام دلوانے کے لئے صدر سوئیکارنو نے 1962ء میں انڈونیشیا کے دارالحکومت جکارتہ میں ایشین گیمز Asian Games کا انعقاد بھی کیا اور اس مقصد کے لئے ایک خصوصی اسٹیڈیم سنیابان اسپورٹس کمپلیکس جو ان دنوں بنگ کارنو اسٹیڈیم (Bung Karno Stadium) کہلاتا ہے بھی تعمیر کروایا۔ صدر سوئیکارنو کو دنیا کے کئی ممالک نے اُس وقت سخت تنقید کا نشانہ بنایا جب انہوں نے ایشین گیمز میں اسرائیل اور تائیوان کے کھلاڑیوں کو شرکت کی اجازت نہ دی۔

1957ء میں صدر سوئیکارنو کو ایک دستی بم کے ذریعے قتل کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ سیکینی (Cikini) میں ایک سکول کے معائنہ کے لئے گئے۔ اس حملہ میں صدر سوئیکارنو تو بچ گئے مگر چھ بچے جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ یہ حملہ ان کے مخالف ایک مذہبی گروپ دارالسلام نے کیا تھا۔ دسمبر 1957ء میں صدر سوئیکارنو نے 246 ڈچ کارخانوں کو قومی تحویل میں لے لیا۔ فروری 1958ء میں صدر سوئیکارنو نے ایک کمیونسٹ مخالف اسلامی تنظیم PRRI کے کارکنوں کی بڑے پیمانے پر گرفتاریوں کا حکم دیا جن پر الزام تھا کہ انہوں نے صدر سوئیکارنو کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے مغربی ممالک سے اسلحہ حاصل کیا۔ اسی سال انڈونیشیا نے ایک امریکی پائلٹ جے ایلن پوپ کا طیارہ مار گرایا جس نے شمالی انڈونیشیا پر بم گرائے تھے۔ اس واقعہ کے بعد امریکہ نے صدر سوئیکارنو کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کرنا شروع کر دیئے۔

صدر سوئیکارنو نے مارچ 1960ء میں منتخب اسمبلی کو تحلیل کر دیا اور اپنی پسند کے افراد پر مشتمل اسمبلی تشکیل دے دی۔ اگست 1960ء میں صدر سوئیکارنو نے نیدرلینڈ (Netherlands) کے ساتھ سفارتی تعلقات منقطع کر لئے اور ڈچ کنٹرول میں موجود انڈونیشیا کے علاقہ پاپوا (Papua) کو آزاد صوبہ قرار دے دیا۔ مئی 1963ء میں انہوں نے مغربی اریان بنک پلان کے تحت اُسے انڈونیشیا کا حصہ قرار دے دیا۔

جولائی 1963ء کو Peoples Consultative Assembly نے سوئیکارنو کو تاحیات صدر منتخب کر لیا۔ صدر سوئیکارنو نے برطانیہ کی حمایت سے قائم ہونے والی فیڈریشن آف ملائشیا Federation of Malaysia کی زبردست مخالفت کی اور مؤقف اختیار کیا یہ اقدام ملائشیا کو انڈونیشیا سے لڑانے کی ایک سازش ہے۔ صدر سوئیکارنو کی شدید مخالفت کے باعث مستقبل میں

ملائشیا اور انڈونیشیا کے درمیان محاذ آرائی کی بنیاد ڈال دی گئی اور اس کے نتیجہ میں انڈونیشیا کو امریکہ سے ملنے والی فوجی امداد بھی بند ہو گئی۔ 1965ء میں صدر سوئیکارنو نے اقوام متحدہ میں انڈونیشیا کی رکنیت ختم کر دی جبکہ امریکہ کی مدد سے ملائشیا اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل کی رکنیت لینے میں کامیاب ہو گیا۔

اگست 1965ء میں صدر سوئیکارنو کی صحت بہت خراب ہو گئی اور وہ ایک پبلک میٹنگ میں بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ تشخیص پر ڈاکٹرز نے بتایا کہ ان کے گرے صحیح طور پر کام نہیں کر رہے۔ صدر سوئیکارنو کی اس بیماری کو خفیہ رکھا گیا۔

30/ستمبر 1965ء کو ایک خوفناک واقعہ پیش آیا جب فوج کے سینئر ترین چھ جرنیلوں کو (30 ستمبر موومنٹ) G30S نامی تنظیم نے قتل کر دیا۔ اس تنظیم کے بارے میں کہا گیا کہ یہ تنظیم کے حکومت کنٹرول میں کام کرتی ہے۔ میجر جنرل سہارتو جو فوج کے اسٹریٹیجک ریزرو کے کمانڈر تھے نے اس واقعہ کے اگلے روز ہی فوج کی مکمل کمان سنبھال لی۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ درحقیقت فوج کے خلاف یہ ایک بغاوت تھی جو غیر منظّم ہونے کی وجہ سے پوری طرح کامیاب نہ ہو سکی۔ جنرل سہارتو نے فوج کے اعلیٰ عہدوں پر اہم تبدیلیاں کر کے فوج پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ ادھر فوج کی طرف سے اندرون ملک اور غیر ممالک میں بھرپور پروپیگنڈہ مہم چلائی گئی کہ فوج کے خلاف بغاوت اور سینئر جرنیلوں کا قتل کمیونسٹ لابی نے کروایا ہے۔ چونکہ صدر سوئیکارنو کی ہمدریاں کمیونسٹ لابی کے ساتھ عیاں تھیں اس لئے پروپیگنڈہ مہم نے صدر سوئیکارنو کی فوج میں پوزیشن بہت کمزور کر دی۔ فوج نے صدر سوئیکارنو کی حامی جماعت PKI کے خلاف کارروائی شروع کر دی اور تمام اہم رہنماؤں کو گرفتار کر لیا اور کچھ کو فوری طور پر سزائے موت بھی دے دی۔ اس صورت حال میں ملک میں خانہ جنگی جیسی صورت حال پیدا ہو گئی اور 66-1965 کے دوران جاوا اور مالی سمیت متعدد شہروں کے بے شمار لوگ مارے گئے۔ عام اندازے کے مطابق پانچ لاکھ سے زائد لوگ ہلاک ہوئے جبکہ گرفتار ہونے والوں کی تعداد 15 لاکھ کے لگ بھگ تھی جن میں سے بہت سے اگلے دس برس تک جیلوں میں پڑے رہے۔

11/مارچ 1966ء کو جنرل سہارتو نے فوج کے دیگر جرنیلوں کی مدد سے صدر سوئیکارنو کو مجبور کر دیا کہ وہ ایک صدارتی حکم کے ذریعے جنرل سہارتو کو اختیارات دیں کہ وہ ملک میں امن و امان قائم کریں۔ صدر سوئیکارنو سے اختیارات حاصل کرنے کے بعد جنرل سہارتو نے کمیونسٹ پارٹی

PKI کو غیر قانونی قرار دے کر اُس پر مکمل پابندی عائد کر دی۔ جنرل سہارتو نے PKI کے تمام اہم راہنماؤں کے ساتھ ساتھ صدر سوئیکارنو کے وفادار اعلیٰ سرکاری عہدیداروں کو بھی گرفتار کر لیا۔

12/ مارچ 1967ء کو پیپلز ریپریذینٹیٹو اسمبلی Peoples Representative Assembly نے سوئیکارنو سے صدارتی ٹائٹل واپس لے لیا اور جنرل سہارتو قائم مقام صدر بن گئے۔ 1968ء میں سوئیکارنو کو باضابطہ طور پر صدارتی عہدہ سے ہٹا کر جکارتہ میں ان کے گھر پر نظر بند کر دیا گیا جہاں وہ 69 برس کی عمر میں 21/جون 1970ء کو انتقال کر گئے۔ احمد سوئیکارنو کو وفات پر قومی ہیرو جیسی عزت نہ دی گئی اور مشرقی جاوا میں بلیتار (Blitar) کے مقام پر انہیں اپنی والدہ کی قبر کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔

امام خمینی

IMAM KHOMEINI

اسلامی جمہوریہ ایران کے سپریم لیڈر

آیت اللہ روح اللہ موسوی خمینی کو دنیا بھر میں امام خمینی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ ایران کے اسلامی انقلاب کے بانی، دور حاضر کے عظیم مذہبی و سیاسی قائداور اسلامی جمہوریہ ایران کے پہلے سپریم کمانڈر تھے۔ امام خمینی نے ایرانی شہنشاہیت کے صدیوں پرانے بت کو پاش پاش کر دیا اور ایرانی قوم کو اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کا موقع فراہم کیا۔

امام خمینی کے دادا سعید احمد موسوی ہندی ہندوستان کے ضلع اتر پردیش کے ایک گاؤں کنتور (Kintur) میں پیدا ہوئے تاہم بعض تاریخی حوالوں سے ان کا تعلق وادی کشمیر سے تھا۔ امام خمینی نے آیت اللہ یوسف کشمیری کے نام ایک خط میں تصدیق کی کہ ان کے دادا وادا کشمیر سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ 1834ء میں ایران چلے گئے اور وہاں خمین میں رہائش پذیر ہو گئے۔ امام خمینی 24 ستمبر 1900ء میں خمین میں ہی پیدا ہوئے۔ امام خمینی نے چھ برس کی عمر میں قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ ایک سال بعد وہ ایک مقامی سکول میں داخل ہو گئے جہاں انہیں دیگر مضامین پڑھنے کا بھی موقع ملا۔

بچپن میں انہیں تعلیم دینے والوں میں اُن کی والدہ کے ایک کزن جعفر اور ان کے بڑے بھائی مرتضیٰ پسندیدے بھی شامل رہے۔

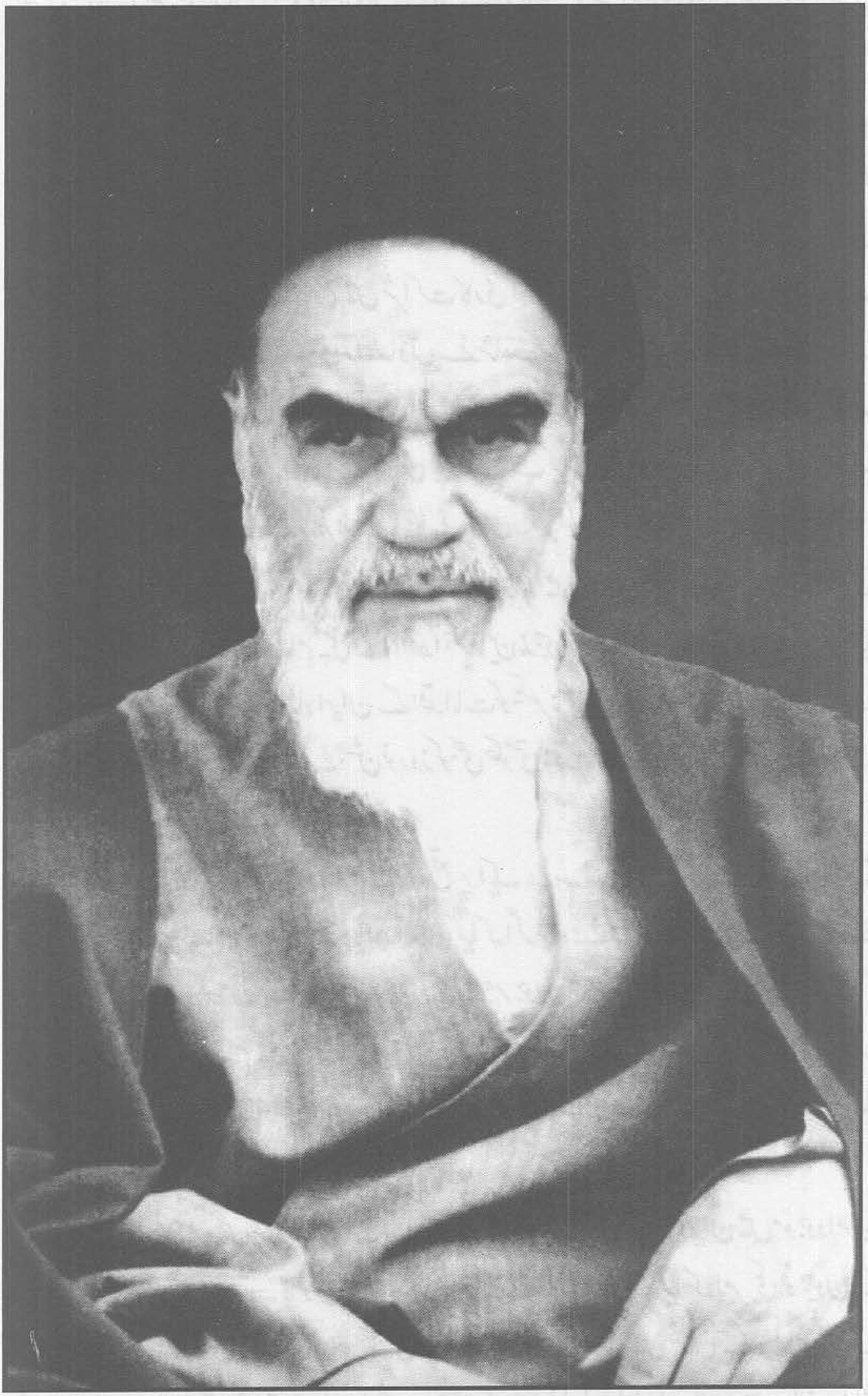
پہلی جنگ عظیم کے بعد امام خمینی کے والدین نے انہیں اصفہان کے ایک اسلامی سکول میں داخل کرانے کا انتظام کیا مگر امام خمینی کی خواہش پر 1920ء میں انہیں عراق کے ایک تعلیمی ادارے

میں داخل کروایا گیا جہاں ان کے استاد ائت اللہ عبدالکریم یازدی تھے۔ اگلے برس ائت اللہ عبدالکریم یازدی کا تبادلہ ایران کے مقدس شہر قم کے ایک اسلامی تعلیمی ادارے میں ہو گیا جس کے باعث امام خمینی کو بھی قم جانا پڑا جہاں انہوں نے دارالشفاء اسکول میں رہائش اختیار کر لی۔ امام خمینی نے قم میں اسلامی تعلیمات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ شاعری اور فلاسفی میں بھی دلچسپی لینا شروع کر دی اور اُس وقت کے معروف استاد مرزا علی اکبر یازدی کی شاگردی اختیار کی۔ مرزا علی اکبر یادزی 1924ء میں انتقال کر گئے مگر امام مینی نے فلاسفی میں دو دیگر اساتذہ جاوید آغا تبریزی اور رفیع قزوینی سے تعلیم کا حصول جاری رکھا۔ امام خمینی کے دیگر اساتذہ میں مرزا محمد علی شاہ آبادی بہت سرکردہ شخصیت تھے۔

روح اللہ خمینی اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد نجف اور قم کے مختلف تعلیمی اداروں میں بطور لیکچرار خدمات سرانجام دیتے رہے مگر اس دوران سیاسی امور سے بھی انہیں خاصی دلچسپی رہی۔ بہت جلد وہ ایک معروف مذہبی سکالر کے طور پر منظر عام پر آ گئے۔ ان کے بہت سے شاگردوں نے بھی بعد ازاں بہت نام کمایا جن میں ایک مرتضیٰ مظاہری بھی تھے جنہیں دنیا ایک بڑے مذہبی سکالر کے طور پر یاد کرتی ہے۔ روح اللہ خمینی نے اسلامی فلسفہ، قانون اور اخلاقیات پر متعدد مضامین اور کتابیں تحریر کیں۔

آیت اللہ روح اللہ خمینی نے 1929ء میں (بعض کتابوں میں 1931ء لکھا گیا ہے) تہران کے ایک مذہبی راہنما کی بیٹی خدیجہ سقفعی خمینی سے شادی کی۔ ان کے ہاں سات بچوں کی پیدائش ہوئی جن میں دو کی کم سنی میں ہی وفات ہو گئی جبکہ ان کی تین بیٹیاں اور دو بیٹے حیات رہے۔ دونوں بیٹوں نے اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مذہبی تعلیم حاصل کی۔ بڑے بیٹے مصطفیٰ کو 1977ء میں شاہ ایران کی قائم کردہ خفیہ تنظیم ساواک نے شہید کر دیا جب وہ عراق کے شہر نجف میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے جبکہ دوسرے بیٹے احمد خمینی 49 برس کی عمر میں 1995ء میں تہران کے ایک ہسپتال میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ امام خمینی کی ایک بیٹی زاہرہ مصطفوی تہران کی ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ امام خمینی کی اہلیہ کا انتقال 2009ء میں ہوا۔

امام خمینی کی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز 1961ء میں ہوا جب عظیم مذہبی سکالر آیت اللہ سید حسین بوروجیزدی (Sayyed Husayn Borujesdi) کا انتقال ہوا اور اگلے برس یعنی 1962ء میں آیت اللہ ابوالقاسم کاشانی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان مذہبی قائدین کی وفات کے



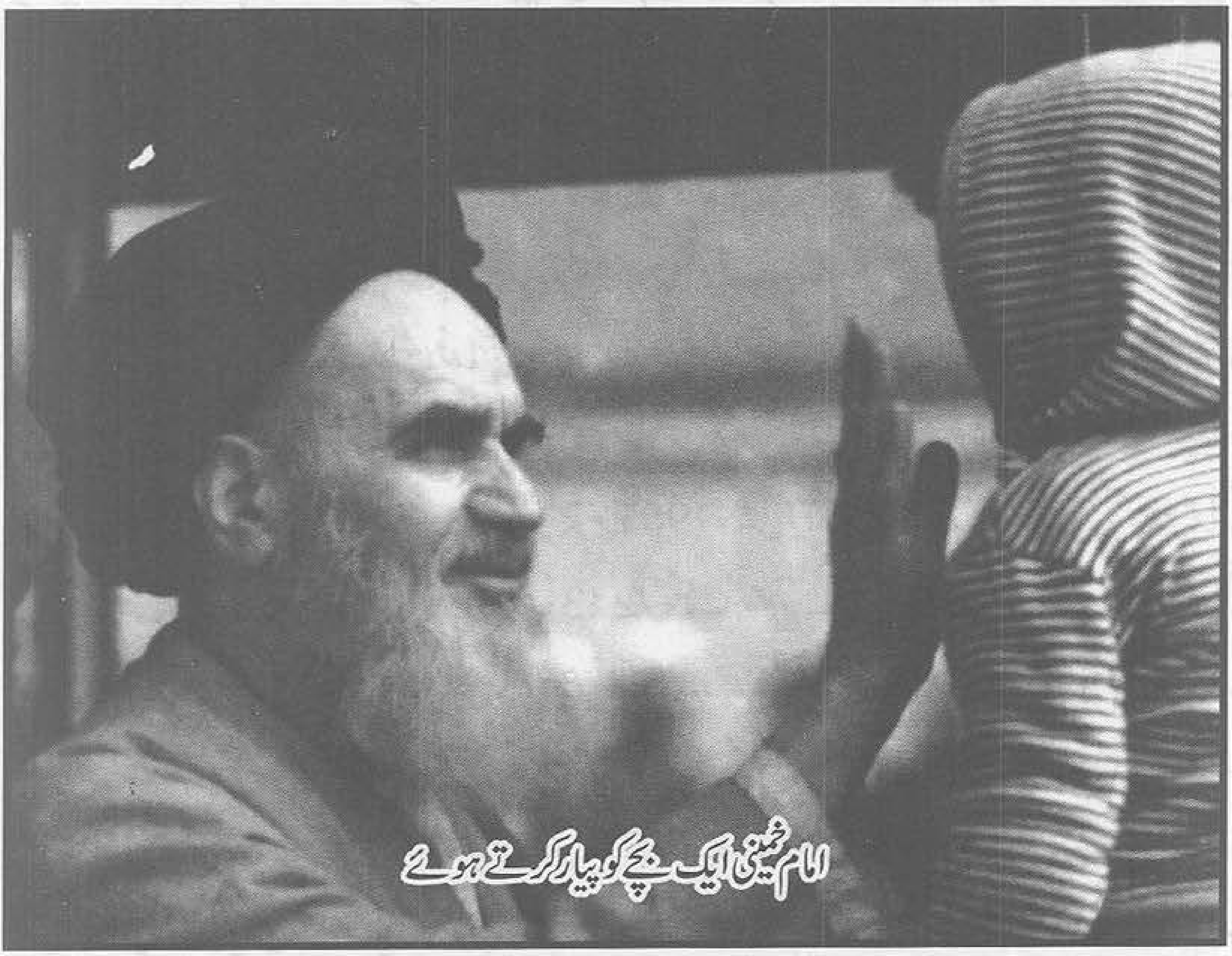
بعد روح اللہ امام خمینی کو قائدانہ کردار ادا کرنا پڑا اور شاہ ایران کے غیر اسلامی عقائد اور اقدامات کے خلاف سینہ سپر ہونا پڑا۔

جنوری 1963ء کو شاہ ایران نے ''سفید انقلاب'' (White Revolution) کے نام سے ایک چھ نکاتی پروگرام کا اعلان کیا جس کے مطابق زرعی اصلاحات، جنگلات قومی ملکیت میں لینا، سرکاری زمینوں کی پرائیویٹ لوگوں کو فروخت، انتخابی اصلاحات جن میں خواتین اور غیر مسلموں کو ووٹ کا حق دینا، صنعتوں کے منافع میں شراکت کاری اور سرکاری سکولوں میں نئے علوم پڑھانے کے لئے مہم چلانا ضروری تھا۔ مذہبی راہنماؤں نے شاہ کے اس پروگرام کی شدید مخالفت کرنے کا اعلان کیا کیونکہ ان کے خیال کے مطابق ان اقدامات کا مقصد معاشرے کو مغربیت کا رنگ دینا تھا۔ امام خمینی نے قم کے سینئر علماء کرام کا ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا اور ان کو قائل کیا کہ وہ سفید انقلاب کے لئے منعقد کئے جانے والے ریفرنڈم کا بائیکاٹ کریں۔

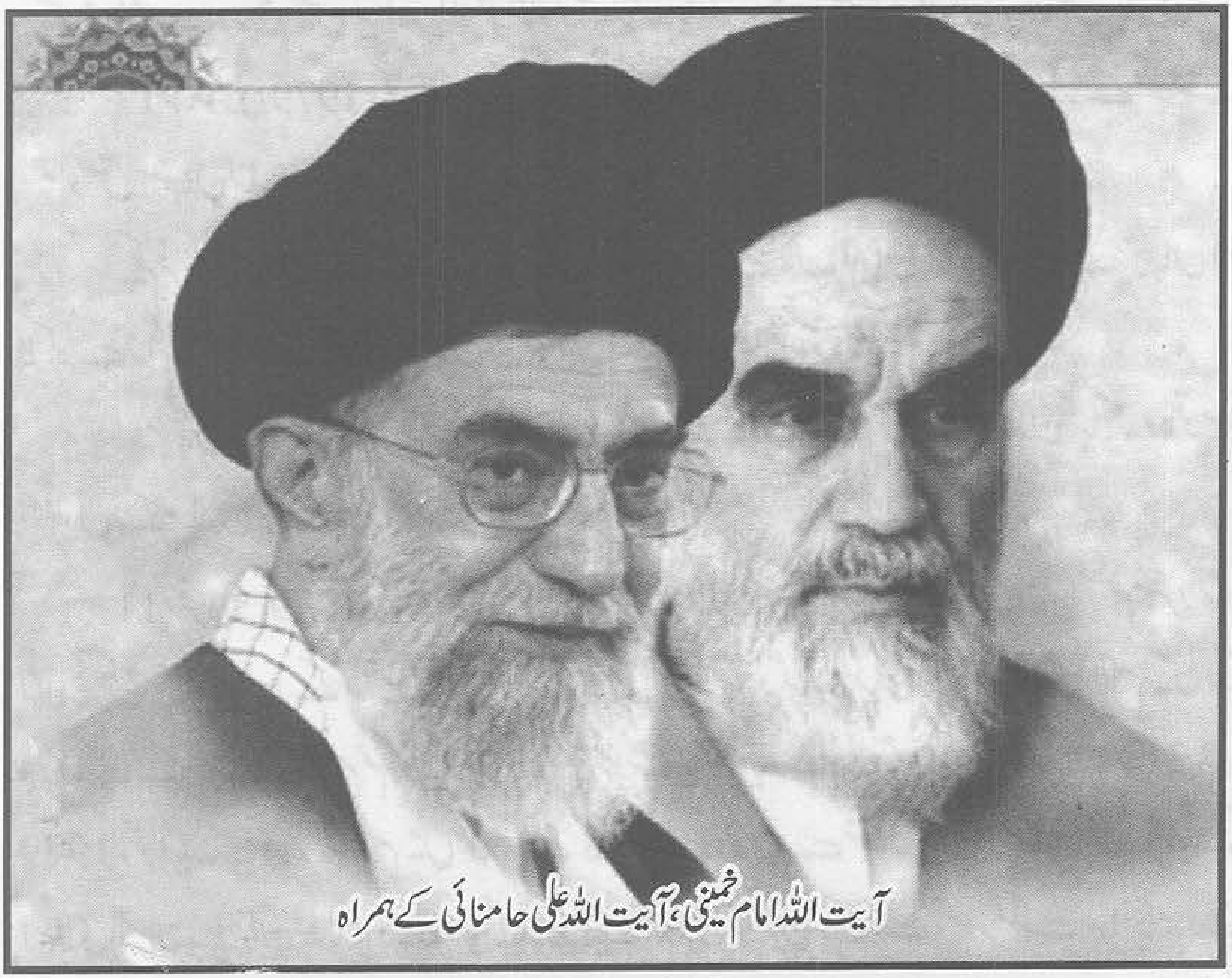
22/ جنوری 1963ء کو علماء نے انتہائی سخت الفاظ میں اعلان کیا کہ وہ ''شاہ اور اس کے منصوبوں کو مسترد کرتے ہیں'' امام خمینی نے آٹھ اہم ترین مذہبی راہنماؤں کے دستخطوں پر مشتمل ایک اعلامیہ بھی جاری کیا جس میں شاہ ایران کے اقدامات کو یکسر ناقابل قبول قرار دیا گیا۔ امام خمینی نے 21/ مارچ 1963ء کو ہونے والے جشن نوروز کو بھی حکومتی اقدامات کے خلاف احتجاج کے طور پر منسوخ کرنے کا اعلان کر دیا۔

3/ جون 1963ء کو عاشورہ محرم کے موقع پر ایک مدرسہ میں خطاب کرتے ہوئے امام خمینی نے شاہ ایران کو عصر حاضر کا یزید قرار دیا اور اعلان کیا کہ اگر شاہ نے اپنے طور طریقے تبدیل نہ کئے تو عوام اسے ملک بدر کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ 5/ جون 1963ء کو شاہ ایران کے خلاف مہم چلانے کے الزام میں امام خمینی کو گرفتار کر لیا گیا جس کے باعث ملک بھر میں ہنگامے پھوٹ پڑے جس کے نتیجہ میں تقریباً 400 افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اگست 1963ء میں امام خمینی کو رہائی مل سکی۔

نومبر 1964ء میں شاہ ایران نے ایک حکم جاری کیا جس کے مطابق ایران میں موجود امریکہ کے فوجیوں کو ملک کے مروجہ قانون سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا اور کہا گیا کہ امریکی فوجیوں کے مقدمات ایرانی عدالتوں کی بجائے امریکہ کی اپنی بنائی ہوئی عدالتوں میں چلیں گے۔ امام خمینی نے شاہ کے اس اقدام کو بھی یکسر مسترد کر دیا جس پر انہیں فوراً گرفتار کر لیا گیا اور چھ ماہ تک پابند سلاسل



امام خمینی ایک بچے کو پیار کرتے ہوئے



آیت اللہ امام خمینی، آیت اللہ علی خامنائی کے ہمراہ

رکھا گیا۔ رہائی پر انہیں ایران کے وزیر اعظم حسن المنصور نے ملاقات کے لئے بلایا اور انہیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ شاہ کے خلاف اپنے اعلانات پر معافی مانگیں۔ انکار پر وزیر اعظم نے امام خمینی کے ساتھ بدتمیزی کی۔ جب یہ خبر عوام تک پہنچی تو امام خمینی کے حامیوں نے اس پر شدید ردعمل ظاہر کیا۔ دو ہفتہ کے بعد وزیر اعظم منصور پارلیمنٹ کی طرف آتے ہوئے قتل کر دیئے گئے۔ حکومت نے قتل کا الزام امام خمینی کے حامی فدائیں اسلام پر عائد کیا اور فداعین اسلام کے چار اہم افراد کو قتل کے الزام میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا اور امام خمینی کو جلاوطن کر دیا گیا۔ ابتدائی طور پر انہیں ترکی بھیجا گیا جہاں وہ بصرہ شہر میں قیام پذیر ہوئے لیکن اکتوبر 1965ء میں انہیں اجازت دے دی گئی کہ وہ عراق کے شہر نجف منتقل ہو جائیں جہاں وہ تقریباً 13 برس تک مقیم رہے۔ 1978ء میں اُس وقت عراقی نائب صدر صدام حسین کے حکم پر امام خمینی کو جبراً ملک بدر کر کے فرانس بھیج دیا گیا جہاں وہ شاہ ایران کی حکومت کے خاتمہ تک رہائش پذیر رہے۔ امام خمینی نے اپنی 14 سالہ جلاوطنی میں بھی شاہ ایران کے خلاف جدوجہد جاری رکھی اور ایران میں موجود اپنے کروڑوں حامیوں کے حوصلے بلند رکھے۔ اس دوران شاہ ایران کے اپنے مخالفین کو ختم کرنے کے لئے ظلم و بربریت کی انتہا کر دی مگر عوام نے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا اور بالآخر شاہ کو مجبور کر دیا کہ وہ تخت چھوڑ کر ایران سے نکل جائیں۔

17/جنوری 1979ء کو شاہ ایران ملک بدر ہو گئے اور وزیر اعظم شاہ پور بختیار نے حکومت کا نظم و نسق سنبھال لیا۔

یکم فروری 1979ء کو امام خمینی فاتحانہ انداز میں اپنے ملک ایران میں واپس آئے جہاں 60 لاکھ سے زائد افراد نے انتہائی پرجوش انداز میں اپنے لیڈر امام خمینی کا استقبال کیا۔

امام خمینی نے شاہ پور بختیار کی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اعلان کیا کہ وہ قوم کی امنگوں کے مطابق نئی حکومت تشکیل دیں گے۔

11/فروری 1979ء کو انہوں نے ڈاکٹر مہدی بازرگان کو ایران کا عبوری وزیر اعظم مقرر کر دیا اس طرح شاہ ایران کے حامیوں کا حکومت سے تعلق ختم ہو گیا۔ ایرانی فوج نے بھی امام خمینی کے احکامات کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ 30 مارچ کو شاہ پور بختیار حکومت چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ 31 مارچ 1979ء کو ایک عوامی ریفرنڈم میں عوام کے 98 فیصد ووٹوں سے شہنشاہیت کا خاتمہ کر کے ملک کو اسلامی جمہوریہ ایران کا نام دے دیا گیا اور ایک عبوری آئین کے تحت امور مملکت سرانجام دیئے جانے لگے۔

نومبر 1979ء کو اسلامی جمہوریہ ایران کا نیا آئین ایک قومی ریفرنڈم کے ذریعے منظور کیا گیا جس کے تحت امام خمینی کو ملک کا سپریم کمانڈر تسلیم کر لیا گیا۔

4/فروری 1980ء کو نئے آئین کے تحت تمام انتخابات منعقد کرائے گئے جس میں ابوالحسن بنی صدر ایران کے پہلے صدر کے طور پر منتخب ہوئے۔

22/اکتوبر 1979ء کو امریکہ نے سابق شاہ ایران کو علاج کی غرض سے امریکہ آنے کی اجازت دے دی جس پر ایران میں شدید ردعمل سامنے آیا اور عوام میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ 4/نومبر 1979ء کو اسلامی انقلابی طلباء کے ایک گروپ نے تہران میں موجود امریکی سفاتخانے پر قبضہ کر لیا اور 52 اہلکاروں کو یرغمال بنا لیا۔ امریکی سفارتی عملہ پر الزام تھا کہ وہ ایران کی سلامتی اور اسلامی حکومت کے خاتمے کی سازشوں میں مصروف ہے۔ امریکی سفارتخانے سے ملنے والی اہم دستاویزات بھی طلباء کی طرف سے منظر عام پر لائی گئیں۔ امریکہ نے اپنے اہل کاروں کو رہا کرانے کے لئے تمام حربے اختیار کئے مگر انہیں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ امریکی سفارتی عملہ 444 روز تک انقلابی طلباء کے ہاتھوں یرغمال رہا۔ 28/فروری 1980ء کو امام خمینی نے اعلان کیا کہ ایرانی مجلس امریکی یرغمالیوں کی قسمت کا فیصلہ کرے گی۔ انہوں نے امریکہ سے مطالبہ کیا کہ شاہ ایران کو ایران کے حوالے کیا جائے تاکہ قوم کے خلاف اُس کے جرائم پر اس کے خلاف مقدمہ چلایا جاسکے۔ اگرچہ چندروز بعد شاہ ایران کا انتقال ہوگیا لیکن امریکی یرغمالیوں کا معاملہ کافی دیر بعد تک لٹکا رہا۔

امام خمینی مسلم امہ کے اتحاد اور یکجہتی کے متمنی تھے اور ان کی خواہش تھی کہ دنیا بھر میں اسلامی انقلاب پھیلایا جائے۔ ادھر مسلم ممالک جہاں آمرانہ حکومتیں قائم تھیں وہ خوفزدہ ہو گئے کہ کہیں ان کے ملکوں میں بھی انقلاب برپا نہ ہو جائے انہوں نے ایران کی اسلامی حکومت کو کمزور کرنے کا ارادہ کر لیا۔ امریکہ، اسرائیل اور ایران مخالف دیگر ممالک بھی ان کوششوں کا حصہ بن گئے۔ ان ملکوں کا آلہ کار بن کر ستمبر 1980ء میں عراق کے صدر صدام حسین نے ایران پر بھرپور حملہ کر دیا اور ایران کے کئی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ امام خمینی کی انقلابی قیادت میں ایرانی فوج اور قوم نے اس حملہ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور 1982ء کے آغاز میں ہی نہ صرف عراق کی پیش قدمی روک دی بلکہ اپنے تمام علاقے عراق سے واگذار کروا لئے۔ عراق اور ایران کے درمیان یہ ہولناک جنگ تمام آٹھ برس یعنی 1988ء تک جاری رہی اور اس میں ایران کے نو لاکھ سے زائد افراد ہلاک ہوئے۔ علاوہ ازیں تین سو ارب ڈالر سے زائد کا مالی نقصان بھی ہوا مگر ایرانی قوم نے یہ نقصانات جرأت اور بہادری کے

ساتھ برداشت کیے۔ امام خمینی نے ہر موقع پر مسلم امہ کے جذبات کی ترجمانی کی اور اپنے خیالات کا برملا اظہار کیا۔ 1988 میں جب ایک انڈین نژاد نام نہاد ناول نگار سلمان رشدی نے قرآنی تعلیمات کے خلاف ایک مذموم کتاب لکھی اور عالم اسلام کے جذبات کو مجروح کیا تو امام خمینی نے سلمان رشدی کو قتل کرنے کا فتویٰ جاری کر دیا اور اعلان کیا کہ سلمان رشدی کا قتل ہمارا مذہبی فریضہ ہے۔ سلمان رشدی کو اپنے اس گھناؤنے عمل پر سرِعام معافی مانگنی پڑی مگر اپنی جان بچانے کے لئے پھر وہ کبھی منظر عام پر نہ آ سکا تاہم ایک جاپانی ٹرانسلیٹر Hitoshi Igarashi جس نے سلمان رشدی کی کتاب کا ترجمہ کیا تھا وہ اپنی جان نہ بچا سکا اور قتل کر دیا گیا۔ امام خمینی پر ان کے مخالفین نے اگرچہ متعدد الزامات عائد کیے کہ انہوں نے شاہ کے حامیوں اور اپنے دشمنوں کا بے دریغ قتل عام کیا اور شہری آزادیوں کو صلب کیا مگر امام خمینی کے حامیوں کا مؤقف ہے کہ انقلاب کے بعد اسلامی حکومت کے استحکام اور عوام کی زندگی میں بہتری لانے کے لئے یہ ضروری تھا۔

امام خمینی بہترین مقرر اور لاجواب رائٹر تھے۔ اسلامی موضوعات کے علاوہ فلسفہ، ادب، شاعری اور گورنمنٹ اینڈ پالیٹکس پر اُن کی بے شمار تحریریں موجود ہیں۔ ان کی تصانیف میں سے چند درج ذیل ہیں۔

1. Whayat al Faqih
2. Forty Hadith
3. Adab as Salat
4. Jehad-i-Akbar
5. Tahrir-ul-Vasleh

24 رمئی 1989ء کو امام خمینی کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی اور انہیں ہسپتال لے جایا گیا جہاں گیارہ روز تک ڈاکٹروں نے ان کی جان بچانے کی بھرپور کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے بالآخر 3رجون بروز ہفتہ وقت کے مطابق رات 10 بجکر 22 منٹ پر وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ امام خمینی کی وفات کی خبر سنتے ہی لاکھوں لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ ان کی نماز جنازہ میں 20 لاکھ سے زائد افراد نے شرکت کی۔ امام خمینی کو تہران میں سپرد خاک کیا گیا اور وسیع وعریض بلڈنگ پر مشتمل ان کا مقبرہ تعمیر کیا گیا۔

ونسٹن چرچل

(WINSTON CHURCHILL)

چرچل برطانیہ کے ایک عظیم لیڈر کے طور پر دنیا بھر میں انتہائی عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں وہ نہ صرف بہترین سیاستدان تھے بلکہ لاجواب مقرر، تاریخ دان، مصنف اور آرٹسٹ بھی تھے۔ چرچل برطانیہ کی تاریخ کے وہ واحد وزیراعظم تھے جنہیں ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔ وہ واحد برطانوی شہری تھے جنہیں ان کی جنگ عظیم کے دوران عظیم خدمات سرانجام دینے پر امریکہ کی اعزازی شہریت سے نوازا گیا۔

چرچل کا پورا نام سر ونسٹن لیونارڈ سپینسر چرچل (Sir Winston Leonard Spencer Churchill) تھا لیکن اگر صرف چرچل بھی کہا جائے تو دنیا بھر میں تاریخ سے واقف لوگ فوراً انہیں پہچان لیتے ہیں۔ چرچل دو مرتبہ برطانیہ کے وزیراعظم رہے۔ پہلی مرتبہ 1940ء سے 1945ء تک اور دوسری مرتبہ 1951ء سے 1955ء تک۔ ان کی پہلی وزارت عظمیٰ کا تمام عرصہ دوسری جنگ عظیم جاری رہی اور انہوں نے جنگ عظیم میں نہ صرف اپنے ملک اور عوام کو بہترین قیادت فراہم کی بلکہ اتحادی ممالک کے اہم لیڈر کے طور پر جرمنی اور جاپان کو شکست سے دوچار کر کے جنگ عظیم کے خاتمہ میں زبردست کردار ادا کیا۔

ونسٹن چرچل 30/نومبر 1874ء کو ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد لارڈ ریڈوف (Lord Reandolf) برطانیہ کے وزیرخزانہ رہ چکے تھے۔ جبکہ ان کی والدہ جینی جیروم (Jennie Jerome) ایک مصروف سماجی شخصیت تھیں۔

چرچل اپنی جوانی میں برطانوی فوج میں بھرتی ہو گئے اور ایک آرمی آفیسر کے طور پر انہوں

نے انڈیا اور سوڈان میں بھی خدمات سرانجام دیں۔ انہوں نے اس دوران اپنے مشاہدات پر مشتمل رپورٹیں اور کتابیں لکھ کر ایک مصنف کی حیثیت سے بھی شہرت حاصل کر لی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران انہوں نے مختلف اہم عہدوں پر بھی خدمات سرانجام دیں جن میں ہوم سیکرٹری کا عہدہ بھی شامل تھا۔ جنگ کے دوران وہ برطانوی نیوی کے امور کے انچارج بھی رہے مگران کے بعض متنازعہ فیصلوں کے باعث انہیں حکومت سے الگ کر دیا گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے اختتام کے بعد چرچل نے 1924ء سے 1929ء تک حکومت میں وزارت خزانہ کے چانسلر کے طور پر خدمات سرانجام دیں۔

چرچل جرمنی کے حکمران ہٹلر کی جارحیت پسندی کے سخت خلاف تھے اور انہوں نے 1930ء کے بعد مسلسل جرمنی کے جنگی جنون کے بارے میں برطانوی عوام اور حکومت کو آگاہ کرنے کے لئے زبردست مہم چلائی۔ جب 1939ء میں دوسری جنگ عظیم کا باضابطہ آغاز ہو گیا تو برطانوی حکومت نے چرچل کو بحریہ کی وزارت کا فرسٹ لارڈ مقرر کر دیا اور 10 رمئی 1940ء کو وزیراعظم چیمبرلین (Chamblerlain) کے اچانک استعفیٰ کے بعد چرچل برطانیہ کے وزیراعظم بن گئے۔ جنگ عظیم دوئم کے دوران ان کی بہترین حکمت عملی، بہادری اور قائدانہ کردار نے انہیں برطانوی عوام کا ہیرو بنا دیا۔ برطانوی ریڈیو پر چرچل کی پرجوش اور جذباتی تقریروں نے برطانوی افواج اور عوام میں جرمن فوجوں کی جارحیت کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا کیا خاص طور پر ان دنوں جب برطانیہ طاقتور جرمنی کے مقابلہ میں تنہا تھا۔

1945ء میں برطانوی کنزرویٹو پارٹی (Conservative Party) کے الیکشن ہار جانے کے باعث چرچل کی وزارت عظمیٰ ختم ہو گئی اور انہیں لیڈر آف اپوزیشن بننا پڑا۔ 1951ء میں انہیں ایک بار وزیراعظم منتخب ہونے کا موقع مل گیا اور وہ 1955ء تک دوسری مرتبہ کے لئے وزیراعظم کے عہدہ پر فائز رہے۔ چرچل کی وفات پر ملکہ برطانیہ الزبتھ دوئم نے ان کی تدفین کی رسومات سرکاری طور پر ادا کرنے کے احکامات جاری کئے اور ان کے جنازہ میں اس قدر غیر ملکی سربراہان اور اہم شخصیات نے شرکت کی جس کی مثال برطانیہ کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

چرچل کی ابتدائی تعلیم ائرلینڈ کے شہر ڈبلن (Dublin) میں ہوئی جہاں ان کے دادا سپنسر چرچل (Spencer Chirchull) حکومت برطانیہ کی طرف سے وائسرائے مقرر ہوئے۔ چرچل نے تین پرائیویٹ اسکولوں میں تعلیم حاصل کی۔ چرچل کے والد 24 رجنوری 1895ء کو صرف 45 برس کی عمر میں انتقال کر گئے جس سے چرچل کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ زندگی عارضی ہے اور



جانے کب اختتام پذیر ہو جائے لہٰذا جس قدر ممکن ہو سکے زندگی میں کوئی نمایاں کام کر لیا جائے۔

12 ستمبر 1908ء کو چرچل نے کلیمٹائن ہوزئر (Clementine Hozier) نامی خاتون سے پسند کی شادی کر لی جن سے 11/ جولائی 1909ء کو ان کی پہلی بیٹی ڈیانہ (Diana) پیدا ہوئی بعدازاں ان کے ہاں مزید چار بچوں نے جنم لیا۔ ان کی آخری بیٹی میری (Mary) 15/ستمبر 1922ء کو پیدا ہوئی۔ ان کی اولاد میں چار بیٹیاں اور ایک بیٹا (Ramdoliph) ہیں۔ چرچل کی چوتھی بیٹی میری گولڈ (Margold) محض تین برس کی عمر میں انتقال کر گئی۔

1893ء میں ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد چرچل نے رائل ملٹری کالج میں داخلہ کے لئے درخواست دی وہ انفینٹری (Infantory) میں داخلہ لینے کے خواہشمند تھے مگر نمبر کم ہونے کے باعث انہیں کیولری (Covollery) میں داخلہ لینا پڑا۔ دسمبر 1894ء میں انہوں نے گریجوایشن مکمل کر لی۔ 20/فروری 1895ء کو انہیں سیکنڈری لیفٹیننٹ کی حیثیت سے خصوصی کمیشن مل گیا۔ بطور سیکنڈ لیفٹیننٹ ان کی کل تنخواہ تین سو پونڈ سالانہ تھی جس سے انہیں اپنے اخراجات پورے کرنے میں بڑی دقت پیش آتی تھی اور ان کی والدہ انہیں اپنی طرف سے سالانہ چار سو پونڈ بھیجتی تھیں تاکہ وہ بطور افیسر روزمرہ زندگی کے معاملات بہتر طریقے سے چلا سکیں۔ 1895ء میں چرچل کیوبا چلے گئے جہاں انہوں نے اسپین کے خلاف کیوبن گوریلوں کی لڑائی کا بغور جائزہ لیا۔ کیوبا میں قیام کے دوران انہیں کیوبا کے ''سگار'' بہت پسند آ گئے جنہیں وہ اپنی باقی ماندہ تمام زندگی میں شوق سے پیتے رہے۔

اکتوبر 1896ء کو چرچل کو ہندوستان کے شہر بمبئی ٹرانسفر کر دیا گیا۔ ہندوستان میں سروس کے دوران چرچل نے ہندوستان کے شمال مغربی سرحد پر برطانوی کمانڈر جنرل جیفری کی قیادت میں پٹھانوں کے لئے جنگ میں حصہ لیا۔ دسمبر 1900ء میں چرچل کی ایک کتاب ''مالاکنڈ کا محاصرہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ 1898ء میں چرچل کو ٹرانسفر کر کے مصر بھیج دیا گیا۔ سوڈان میں بھی چرچل نے فوجی خدمات سرانجام دیں۔ 1898ء میں وہ واپس برطانیہ چلے گئے اور انہوں نے اپنی دو کتابوں کو مکمل کرنے پر مکمل توجہ مرکوز کر دی۔ 5/مئی 1899ء کو چرچل نے برطانوی فوج سے علیحدگی اختیار کر لی۔

فوج سے استعفیٰ کے بعد چرچل نے صحافت کے میدان میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کی ٹھان لی۔ اکتوبر 1899ء میں برطانیہ اور متحدہ امریکی ریاستوں کے درمیان لڑائی کی کوریج کے لئے



وزیراعظم چرچل عوام سے خطاب کرتے ہوئے



دوسری جنگ عظیم کے دوران وزیراعظم چرچل ایک مشین گن کا معائنہ کرتے ہوئے

انہیں ایک فوجی رپورٹر کے طور پر 250 پونڈ ماہانہ پر نوکری مل گئی۔ اس دوران وہ دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے اور انہیں جنگی قیدیوں کے کیمپ میں بھیج دیا گیا جہاں سے وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور 300 میل کا فاصلہ طے کر کے پرتگال پہنچ گئے۔ اس فرار نے انہیں کچھ عرصہ کے لئے برطانیہ میں ایک ہیرو کی حیثیت دے دی۔ 1900ء کے برطانوی انتخابات کے بعد چرچل نے برطانیہ کا ملک گیر دورہ کیا بعدازاں وہ کینیڈا اور امریکہ کے دورے کے دوران اپنی پرجوش خطابت کے باعث پانچ ہزار پونڈ کمانے میں کامیاب ہو گئے۔ برطانیہ کی ریگولر آرمی سے استعفیٰ کے بعد 1902ء میں وہ فوج کے شاہی دستہ میں شامل ہو گئے جہاں انہیں کیپٹن کی حیثیت میں کمیشن ملا۔ 1905ء میں انہیں میجر کے عہدہ پر ترقی دے دی گئی۔ ستمبر 1916ء میں چرچل کو افسران کے ٹیرٹو ایل ریزوز (Territorial Reserves) میں ٹرانسفر کر دیا گیا جہاں انہوں نے 1924ء میں پچاس سال کی عمر تک خدمات سرانجام دیں۔

اکتوبر 1911ء کو چرچل برطانوی وزارت بحریہ کے فرسٹ لارڈ مقرر ہوئے۔ مئی 1915ء کو انہوں نے فرسٹ لارڈ کے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا۔ بطور فرسٹ لارڈ وزارت بحریہ ان کی کامیابیوں میں برطانیہ کے لئے تیل کی ضروریات پوری کرنے کے لئے اینگلو پرشین آئل کمپنی Anglo-Persian Oil کا قیام اور اس کے ذریعے آئندہ بیس برس کے لئے پرشین گلف سے برطانیہ کو تیل کی سپلائی کا معاہدہ شامل ہے۔

چرچل کی سیاست کا آغاز 1900ء میں منعقد ہونے والے عام انتخابات میں حصہ لینے سے ہوا جب وہ اولڈہیم (Oldhiam) سے رکن پارلیمنٹ منتخب ہو گئے۔ 1908ء چرچل کابینہ میں بورڈ آف ٹریڈ کے صدر بنا دیئے گئے جن کا عہدہ وزیر کے برابر تھا۔ ان دنوں وزیر بن جانے والے ہر رکن پارلیمنٹ کے لئے ضروری تھا وہ اپنی پارلیمنٹ کی رکنیت سے مستعفی ہو کر ضمنی انتخاب میں دوبارہ حصہ لے۔ چرچل کو بھی ایسا ہی کرنا پڑا مگر وہ ضمنی الیکشن میں اپنی سیٹ سے ہاتھ دھو بیٹھے مگر کچھ ہی عرصہ بعد انہوں نے ایک دوسرے انتخابی حلقہ سے کامیابی حاصل کر لی۔ اپنی وزارت کے دوران انہوں نے بیروزگاری ختم کرنے اور مزدوروں کو بہتر اجرت دلوانے کے لئے خصوصی قوانین بنوائے۔ اپنی زندگی اور سیاست کے باقی برسوں میں چرچل ہمہ وقت انتہائی متحرک نظر آئے اور سیاست میں اپنا انفرادی مقام پیدا کر لیا۔ کچھ عرصہ کے لئے چرچل نے کنزرویٹو پارٹی کی ہائی کمان سے بعض اختلافات کے باعث لبرل پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور 1923ء کے ضمنی انتخابات کے باعث

لبرل پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور 1923ء کے ضمنی انتخابات کے میں لبرل پارٹی کے امیدوار کی حیثیت سے الیکشن لڑا مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ جلد ہی انہوں نے دوبارہ کنزرویٹو پارٹی جوائن کر لی اور 1924ء میں ایک بار پھر رکن پارلیمنٹ منتخب ہو گئے۔ 1924ء میں چرچل کو وزیر خزانہ بنا دیا گیا۔ وزیر خزانہ کی حیثیت میں انہوں نے برطانیہ کی مُعیشت کو مضبوط تر بنانے اور برطانیہ کو ایک فلاحی ریاست بنانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔

1929ء کے عام انتخابات میں کنزرویٹو پارٹی کو بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اگلے دو برس تک چرچل سیاست سے تقریباً کنارہ کش رہے۔ 1931ء میں رمزے میکلڈونلڈ کی قیادت میں بننے والی نیشنل گورنمنٹ میں بھی چرچل کو کابینہ میں شمولیت کی دعوت نہ دی گئی اس طرح وہ کسی حد تک سیاسی تنہائی کا شکار ہو گئے۔ 1932ء میں انہوں نے مختلف موضوعات پر لکھے گئے اپنے مضامین پر مشتمل کتاب "Thoughts and Adventures" شائع کی۔

چرچل نے 1930ء ہندوستان کی آزادی کی تحریک کی بھرپور مخالفت کی۔ انہوں نے 1931ء میں اس سلسلہ میں منعقد ہونے والی راؤنڈ ٹیبل (Round Table) کانفرنس پر بھی شدید تنقید کی۔ وہ ہندوستان کو آزاد حیثیت دینے کے حق میں نہیں تھے۔ 1940ء میں وزیراعظم بننے کے بعد انہوں نے ہندوستان میں کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان بڑھتے ہوئے اختلافات پر خوشی اور اطمینان کیا اور اس امید کا اظہار بھی کیا کہ دونوں جماعتوں کے اختلافات انتہائی تلخ اور خونی ثابت ہوں گے۔

پہلی مرتبہ بطور وزیراعظم ونسٹن چرچل کا تمام عرصہ دوسری جنگ عظیم کی نظر ہو گیا۔ اس جنگ میں سب سے زیادہ خطرہ برطانیہ کو ہی تھا مگر چرچل کی اعلیٰ جنگی حکمت عملی اور سفارتکاری نے برطانیہ کو عظیم شکست سے دوچار ہونے سے نہ صرف بچا لیا بلکہ اپنے ملک اور عوام کو فتح سے ہمکنار کر دیا۔ انہوں نے امریکہ سے بہترین تعلقات قائم کر لئے جس میں ان کے امریکی صدر فرینکلن روز ویلٹ کے ساتھ ذاتی مراسم کا بڑا عمل دخل تھا۔ جب ہٹلر نے سوویت یونین پر بھی حملہ کر دیا تو ونسٹن چرچل نے سوویت یونین کی لیڈرشپ کے بدترین مخالف ہونے کے باوجود یویت یونین کو بھرپور فوجی امداد فراہم کر دی اس طرح سوویت یونین بھی ان کے اتحادی طور پر اپنا کردار ادا کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اسی طرح عراق سمیت دیگر اتحادی ممالک سے بھی چرچل نے بہترین تعلقات استوار کر لئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جرمنی، جاپان اور ان کے اتحادی ممالک کو جنگ عظیم میں شرمناک شکست سے

دو چار ہونا پڑا۔ دوران جنگ چرچل کے کردار کو دنیا بھر کے تاریخ دان سنہری حروف سے پیش کرتے ہیں۔

اگرچہ بطور وزیراعظم اور کمانڈر دوسری جنگ عظیم میں چرچل کا کردار شاندار تھا مگر عوام کی فلاح و بہبود کے دیگر کاموں پر توجہ نہ دینے کے باعث 1945ء کے عام انتخابات میں چرچل کو عوام نے ووٹ کا حق دار نہ سمجھا اور وہ انتخابات میں شکست کھا گئے۔ پھر آئندہ چھ برس تک برطانوی پارلیمنٹ میں انہیں بطور لیڈر آف دی اپوزیشن اپنا کردار ادا کرنا پڑا۔

1951ء کے عام انتخابات میں چرچل کی جماعت فتح سے ہمکنار ہوئی اور چرچل اکتوبر 1951ء میں دوسری مرتبہ وزیراعظم برطانیہ بن گئے۔ وزارت عظمیٰ کی دوسری ٹرم میں انہوں نے ملک کی ترقی اور عوام کی فلاح و بہبود کے لئے نہایت اہم اقدامات کیے۔

1949ء کے موسم گرما میں چرچل فرانس کے جنوبی علاقہ میں چھٹیاں گزارنے گئے ہوئے تھے کہ انہیں دل کا دورہ پڑا۔ جون 1953ء میں انہیں اپنی لندن والی سرکاری رہائش گاہ میں دل کا ایک اور شدید دورہ پڑا۔ اس خبر کو عوام اور پارلیمنٹ سے خفیہ رکھا گیا اور ظاہر کیا گیا کہ چرچل کام کی زیادتی کے باعث تھکن کا شکار ہو گئے ہیں۔ چرچل کی زندگی تو بچ گئی مگر روبصحت ہونے کے باوجود انہیں بولنے اور ملنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا۔ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر بھی کافی سست ہو گئے۔ بالآخر 1955ء کو انہیں وزارت عظمیٰ سے مستعفی ہونا پڑا۔ بعدازاں ان کی صحت کبھی بھی مکمل طور پر بحال نہ ہو سکی۔ صحت کی خرابی کے باوجود انہوں نے اپنے آپ کو سیاست میں متحرک رکھنے کی کوشش کی۔ 15/جنوری 1965ء کو انہیں دل کا ایک شدید دورہ پڑا جس نے انہیں مفلوج کر کے رکھ دیا۔

24/جنوری 1965ء کو نوے برس کی عمر میں چرچل اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ملکہ برطانیہ کے حکم پر ان کی میت کو تین دن کے لئے دیدار عام کے لئے رکھا گیا۔ 30/جنوری 1965ء کو ان کی تدفین کی باضابطہ رسومات ادا کر دی گئیں۔ ملکہ برطانیہ نے بطور خاص تدفین کی رسومات میں شرکت کی۔

قائداعظم محمد علی جناح

QUAID-I-AZAM M. A. JINNAH

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے بانی، بابائے قوم

قائداعظم محمد علی جناح کا شمار دنیا کے صف اوّل کے لیڈروں میں ہوتا ہے۔ وہ بیسویں صدی کے قائدین میں سرکردہ حیثیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے اپنی بہترین قائدانہ صلاحیتوں سے ناممکن کو ممکن کر دکھایا اور دنیا کے نقشے پر ایک نئی آزاد مسلم مملکت کو وجود پذیر کر دیا جسے پاکستان کہا جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے دیگر قائدین اور قائداعظم محمد علی جناح میں واضح فرق یہ ہے کہ دیگر قائدین جانے پہلے سے موجود اپنے ملک میں کسی نظام کو اکھاڑ پھینکا یا کسی غیر ملکی قبضہ سے اپنی قوم کو نجات دلائی مگر قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی قوم کو نہ صرف برطانوی راج سے نجات دلائی بلکہ ہندو تسلط کو بھی ہمیشہ کے لئے دفن کرتے ہوئے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو ایک الگ شناخت عطا کی اور اُن کے لئے ایک مکمل طور پر آزاد مملکت قائم کر دی۔ قائداعظم محمد علی جناح کی شخصیت جدوجہد اور کارناموں پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور کئی مزید لکھی جاسکتی ہیں مگر زیر نظر کتاب میں ان کے مختصر حالات زندگی پیش کئے جارہے ہیں۔

محمد علی جناح اپنے سکول ریکارڈ کے مطابق 20/ اکتوبر 1875ء کو کراچی کے وزیر مینشن میں پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش کے حوالے سے قائداعظم کی پہلی سوانح عمری لکھنے والے سروجنی نائیڈو (Sarojini Naidu) نے 25/ دسمبر 1876ء کا ذکر کیا ہے جسے اکثریتی حلقوں نے درست تسلیم کیا ہے۔ محمد علی جناح کے والد جناح بھائی پونجا (Jinah Bhai Poonja) جو 1857ء میں پیدا ہوئے اور 1901ء تک حیات رہے۔ ایک خوشحال گجراتی تاجر تھے جو محمد علی جناح کی پیدائش سے قبل

کاٹھیوار (Kathiawar) گجرات سے نقل مکانی کر کے سندھ میں رہائش پذیر ہو گئے۔ محمد علی جناح سات بہن بھائیوں میں سے سب سے بڑے تھے ان کے بھائیوں کے نام احمد علی، بندے علی اور رحمت علی تھے جبکہ بہنوں کے نام مریم، فاطمہ اور شیریں تھے۔ اُن کی مادری زبان گجراتی تھی لیکن وہ سندھی اور انگریزی زبانیں بھی جانتے تھے۔

محمد علی جناح نے ابتدائی تعلیم کئی سکولوں سے حاصل کی جن میں سندھ مدرستہ الاسلام کراچی، گوکل داس شیخ پرائمری سکول بمبئی اور کرسچین مشنری سوسائٹی ہائی سکول کراچی شامل ہیں جہاں سے 16 برس کی عمر میں انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔

1892ء میں محمد علی لندن چلے گئے اور گراہم شپنگ اینڈ ٹریڈنگ کمپنی میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس کمپنی کے محمد علی جناح کے والد کی کراچی میں موجود کمپنی کے ساتھ گہرے کاروباری روابط تھے۔ بعض تاریخی حوالوں کے مطابق محمد علی جناح نے لندن جانے سے قبل اپنی والدہ کی خواہش پر اپنی ایک کزن ایمی بائی جناح (Emibai Jinnah) سے شادی کر لی جن کا چند ماہ بعد انتقال ہو گیا۔ لندن میں قیام کے دوران ہی محمد علی جناح کی والدہ بھی وفات پا گئیں۔

محمد علی جناح نے جلد ہی ملازمت چھوڑ دی اور لندن میں واقع لنکنز ان (Licon's Inn) میں داخلہ لے کر قانون کی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ تین سال بعد 19 برس کی عمر میں بار ایٹ لاء کا امتحان پاس کر لیا اور انگلینڈ میں کم عمر ترین انڈین بیرسٹر ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔

لندن میں تعلیم کے دوران ہی محمد علی جناح سیاست میں گہری دلچسپی لینے لگے اور انگلینڈ کے جمہوری نظام نے انہیں بہت متاثر کیا کیونکہ اس نظام میں اظہار رائے کی آزادی اور ترقی پسند سیاست کرنے کے مواقع میسر تھے۔ وہ برطانوی سیاستدانوں Gledstine اور John Morley سے بہت متاثر تھے اس کے علاوہ برطانیہ میں مقیم انڈین سیاستدانوں دادا بھائی نائیرو جی اور فیروز شاہ مہتا نے بھی محمد علی جناح کو بہت متاثر کیا۔ محمد علی جناح نے فیروز شاہ مہتا کی انتخابی مہم میں بھی بھرپور حصہ لیا جو برٹش پارلیمنٹ کے پہلے انڈین رکن منتخب ہوئے۔

محمد علی جناح نے لندن میں اپنے قیام کے دوران ہی برطانیہ کی اپنے اور ہندوستان کے لئے الگ الگ پالیسیوں کا بھی بغور جائزہ لیا۔ اور ہندوستانی عوام کے ساتھ انگریز حکمرانوں اور سرکاری افسروں کے متعصّبانہ رویہ نے محمد علی جناح کی سوچ میں واضح تبدیلی پیدا کر دی اور ہندوستان کو انگریزوں کی حاکمیت سے آزاد کرانے کے خیال نے ان کے دل میں جگہ بنالی۔



1896ء میں محمد علی جناح کے والد کو اپنے کاروبار میں سخت خسارے کا سامنا کرنا پڑا جس کے باعث محمد علی جناح لندن میں مزید قیام نہ کر سکے اور انہیں ہندوستان واپس آنا پڑا۔ انڈیا واپسی پر محمد علی جناح بمبئی میں قیام پذیر ہوئے جہاں انہوں نے مالابار ہلMalabar Hill میں اپنا گھر تعمیر کروایا جسے اب جناح ہاؤس کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ہندوستان میں محمد علی جناح ایک بہترین بیرسٹر کے طور پر شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گئے۔ اپنی قابلیت اور ذہانت کے باعث وہ انتہائی کامیاب وکیل بن گئے۔

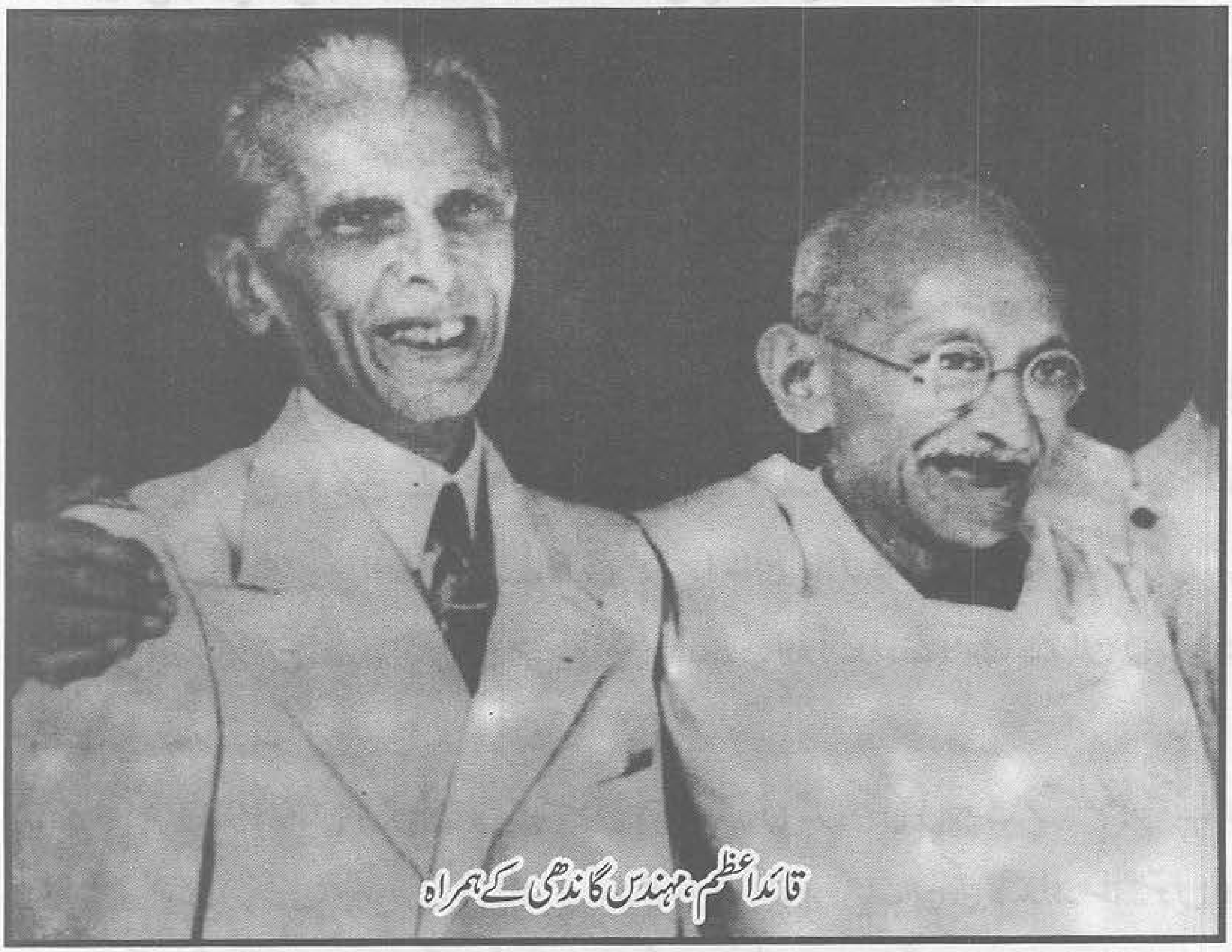
محمد علی جناح کو 1905ء میں اس وقت بے پناہ شہرت حاصل ہوئی جبکہ انڈین لیڈر Gangadhar Tilak نے انہیں بغاوت کے مقدمہ میں اپنا وکیل مقرر کیا۔ یہ مقدمہ Caucus case کے نام سے مشہور ہوا۔ 1896ء میں ہی محمد علی جناح نے انڈین نیشنل کانگرس میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس وقت تک انڈین نیشنل کانگرس ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت تھی۔ محمد علی جناح کو ان کی قابلیت کے باعث 60 رکنی ایمپریل لیجسلیٹو کونسل (Imperial Legislative Council) کا ممبر بھی بنا لیا گیا۔ اس کونسل کے ممبر کی حیثیت سے محمد علی جناح نے Child Marriage Restraint Act، مسلم وقف کو قانونی حیثیت دینے اور انڈین ملٹری اکیڈمی کے قیام جیسے قوانین منظور کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔

1906ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ ابتدائی چند برسوں میں محمد علی جناح مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر زیادہ سرگرم عمل نہ ہوئے لیکن 1913ء میں انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ میں باضابطہ شمولیت اختیار کر لی اور 1916ء میں لکھنؤ میں منعقد ہونے والے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں انہیں جماعت کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ 1916ء میں محمد علی جناح نے کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان "معاہدہ لکھنؤ" (Lakhnow Pact) کروانے میں اہم کردار ادا کیا جس میں طے پایا گیا تھا کہ ہندوستان میں حکومتی آزادی اور حکومت برطانیہ سے نبرد آزما ہونے کے لئے مشترکہ جدوجہد کی جائے گی۔ 1916ء میں ہی آل انڈیا ہوم رول لیگ (All India Home Rule League) کا قیام عمل میں آیا اور محمد علی جناح اس کے صدر منتخب کئے گئے۔ محمد علی جناح نے اس پلیٹ فارم سے دیگر انڈین قائدین کے ہمراہ برطانوی حکومت سے مطالبہ کر دیا کہ وہ کینیڈا، نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کی طرح ہندوستان میں بھی خودمختار حکومت کا قیام عمل میں لائے۔

1918ء میں محمد جناح نے رتنا بائی خاتون سے شادی کی۔ رتنا بائی محمد علی جناح کے ایک



قائداعظم ہندوستان کے آخری برطانوی وائس رائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور اُنکی اہلیہ کے ہمراہ



قائداعظم، مہندرس گاندھی کے ہمراہ

زخمی ہو گئے۔ تفتیش پر معلوم ہوا کہ یہ حملہ خاکسار تحریک ایک انتہا پسند کارکن نے کیا تھا۔ برطانوی وزیر اسفورڈ کرپس (Stafford Cripss) کے مشن کے دوران قائداعظم نے مؤقف اپنایا کہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں مسلم لیگ اور کانگرس کے وزراء کی تعداد برابر ہونی چاہیئے۔

1944ء میں مہندس گاندھی نے بمبئی میں قائداعظم سے 14 بار ملاقات کی اور انہیں پاکستان کے قیام کے لئے جدوجہد کرنے سے روکنے کی کوشش کی مگر قائداعظم دوقومی نظریہ کو ذہنی طور پر تسلیم کر چکے تھے اور اُن کو یقین ہو گیا تھا کہ اب مسلمان اور ہندو اکٹھے نہیں رہ سکتے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران قائداعظم نے ہٹلر کے مقابلے میں برطانوی حکومت کی حمایت کی اور برطانوی حکمرانوں کو قائل کیا کہ جنگ میں فتح مند ہونے کی صورت میں برصغیر پاک و ہند پر اپنا تسلط ختم کر دیں۔ 1946ء میں انڈیا کی آئین ساز اسمبلی کے انتخابات میں مسلم لیگ کو بہت بڑی اکثریت میں مسلمان نشستیں مل گئیں جبکہ ہندو اکثریت کے علاقوں میں کانگرس بھاری اکثریت سے جیت گئی۔ ان انتخابات کے نتیجہ میں مرکز اور صوبوں میں جو حکومتیں بنیں مسلم لیگ اُن میں شامل ہو گئی۔ 1946ء میں ہی برطانیہ کا ایک وزارتی کمیشن ہندوستان آیا۔ اس کے ذمہ ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنا تھا۔ کیبنٹ مشن نے 16 مئی 1946ء کو ایک منصوبے کا اعلان کیا جس کے تحت یونائیٹڈ انڈین اسٹیٹ کے قیام کی تجویز دی گئی جس میں مسلم علاقوں میں مسلمانوں کے خودمختار صوبے قائم کرنے کی بات کی گئی۔ کانگرس نے اس منصوبے کو مسترد کر دیا۔ 16/ جون کو کیبنٹ مشن نے ایک اور منصوبے کا اعلان کیا جس میں ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کو ضروری قرار دیا گیا۔ مسلم لیگ نے اس منصوبہ کا خیر مقدم کیا لیکن کانگرس نے اپنی ہٹ دھرمی برقرار رکھی اور ہندوستان کی تقسیم کو ناقابل قبول قرار دیا۔ 16/ اگست 1946ء کو قائداعظم نے ہندوستان کے مسلمانوں کو پاکستان کے حصول کے لئے براہ راست اقدام (Direct Action) کرنے کا حکم دے دیا جس کے نتیجہ میں پورے ملک میں ہنگامے پھوٹ پڑے۔ خاص طور پر کلکتہ اور بنگال کے ضلع نواکھلی میں شدید شورش برپا ہو گئی۔ صرف صوبہ بہار میں 7000 سے زائد افراد ان ہنگاموں میں اپنی جانیں گنوا بیٹھے۔

25/ اکتوبر 1946ء کو ہندوستان کی عبوری حکومت کا اعلان کیا گیا۔ مسلم لیگی وزراء نے 26/ اکتوبر کو اپنے عہدوں کا حلف اٹھایا۔ قائداعظم نے اس حکومت میں کوئی عہدہ قبول نہ کیا۔ تاہم قائداعظم عبوری حکومت میں مسلم لیگی وزراء کی تعداد کانگرسی وزراء کے برابر رکھوانے میں کامیاب

رہے۔ اگرچہ مسلم لیگ اس وقت اقلیتی جماعت تھی۔ یہ مخلوط حکومت زیادہ دیر نہ چل سکی اور کانگرس کو یقین ہوگیا کہ قیام پاکستان کا مطالبہ تسلیم کیئے بغیر کوئی چارہ نہیں لہٰذا انہوں نے ہندوستان کی تقسیم کا فارمولا تسلیم کرلیا۔ ہندوستان کے مسلم اکثریت والے علاقے مغربی پنجاب، سندھ، بلوچستان اور مشرقی بنگال پاکستان کا حصہ قرار پائے جبکہ شمالی مغربی سرحدی صوبہ جواب خیر پختون خوا کہلاتا ہے جولائی 1947ء کوایک ریفرنڈم کے ذریعے پاکستان کا حصہ بن گیا۔

14/اگست 1947ء کو پاکستان کی آزادی کا باضابطہ اعلان کر دیا گیا۔ قائداعظم محمد علی جناح اس نئی اسلامی مملکت پاکستان کے گورنر جنرل منتخب ہو گئے جبکہ لیاقت علی خان کو پاکستان کا پہلا وزیراعظم بنایا گیا۔

قیام پاکستان کے بعد قائداعظم کوزیادہ عرصہ زندہ رہنا نصیب نہ ہوا اور 11/ستمبر 1948ء کو رات 10 بج کر 20 منٹ پر وہ گورنر جنرل ہاؤس کراچی میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور انہیں کراچی میں ہی سپرد خاک کیا گیا۔ قائداعظم کی آخری آرام گاہ پر ایک عظیم الشان مقبرہ تعمیر کیا گیا جسے مزار قائداعظم کا نام دیا گیا۔ جہاں ہزاروں لوگ روزانہ ان کے درجات کی بلندی کے لئے فاتحہ خوانی کرتے ہیں۔ قائداعظم محمد علی جناح کی وفات کے بعد بھی پاکستانی قوم نے اپنے اس عظیم محسن کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ قائداعظم کے جنم دن اور وفات کے دن پاکستان میں سرکاری تعطیل کی جاتی ہے۔ پاکستان کے بڑے کرنسی نوٹوں پر ان کی تصویر موجود ہوتی ہے اور پاکستان کے تمام سرکاری اور نجی دفاتر میں اُن کی تصاویر آویزاں ہوتی ہیں۔ ملک کے متعدد اہم ادارے قائداعظم کے نام پر بنائے گئے ہیں جیسے کراچی میں قائداعظم انٹرنیشنل ائرپورٹ، اسلام آباد میں قائداعظم یونیورسٹی وغیرہ۔

بیرونی ممالک میں بھی قائداعظم کی بطور عظیم لیڈر خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے مثلاً ترکی کے دارالحکومت انقرہ میں ایک اہم سڑک قائداعظم کے نام پر ہے جبکہ ایران کے دارالحکومت تہران کے ایک اہم ہائی وے کو قائداعظم سے منسوب کیا گیا ہے جبکہ امریکہ کے شہر شکاگو میں ایک مشہور دیون ایونیو (Devon-Avenue) کے ایک حصے کا نام ''محمد علی جناح وے'' رکھا گیا ہے۔ قائداعظم کی زندگی پر دنیا بھر میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں اور ان کی زندگی پر کئی فلمیں بھی تیار کی گئی ہیں۔

مصطفیٰ کمال اتاترک

MUSTAFA KEMAL ATATURK

جدید ترکی کے بانی

جدید ترکی کے بانی مصطفیٰ کمال اتاترک ایک تجربہ کار فوجی افسر، انقلابی لیڈر، بہترین لکھاری اور ریپبلک آف ترکی (Republic of Turkey) کے پہلے صدر تھے۔ ترک عوام انہیں بابائے قوم کے لقب سے پکارتے ہیں۔ کمال اتاترک پہلی جنگ عظیم کے دوران فوجی افسر کی حیثیت سے اپنی بہادری، بہترین جنگی حکمت عملی اور فتوحات کے باعث پوری دنیا میں ایک ممتاز شخصیت کے طور پر سامنے آئے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران جب سلطنت عثمانیہ کو شکست ہوگئی اور ترکی پر غیروں کا قبضہ ہوگیا تو کمال اتاترک نے ترکش نیشنل موومنٹ (Turkish National Movement) کی قیادت کرتے ہوئے ترکی کی آزادی کی جنگ لڑی اور اتحادی قوتوں کو شکست فاش سے دوچار کیا۔ بعدازاں بطور صدر مملکت انہوں نے ترکی کو ایک جدید ملک بنانے اور ترک عوام کو ترقی اور خوشحالی کی نئی منزلوں تک پہنچانے میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا۔

مصطفیٰ کمال اتاترک 19 رمئی 1881ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام علی رضا آفندی اور والدہ کا نام زبیدہ خانم تھا۔ والد یونانی جبکہ والدہ ترک تھیں۔

پیدائش پر والدین نے ان کا نام مصطفیٰ رکھا لیکن سکول کی تعلیم کے دوران ان کی ذہانت اور اعلیٰ کارکردگی پر اُن کے میتھمیٹکس (Mathematics) کے ٹیچر نے ان کے نام کے ساتھ کمال کا اضافہ کردیا کیونکہ وہ ہر کام میں کمال تھے۔ اتاترک اُن کا لقب ہے جس کا مطلب ''ترکوں کا باپ'' یعنی Father of the Turks ہے۔ ابتدائی تعلیم کے لئے ان کی والدہ نے انہیں ایک دینی سکول

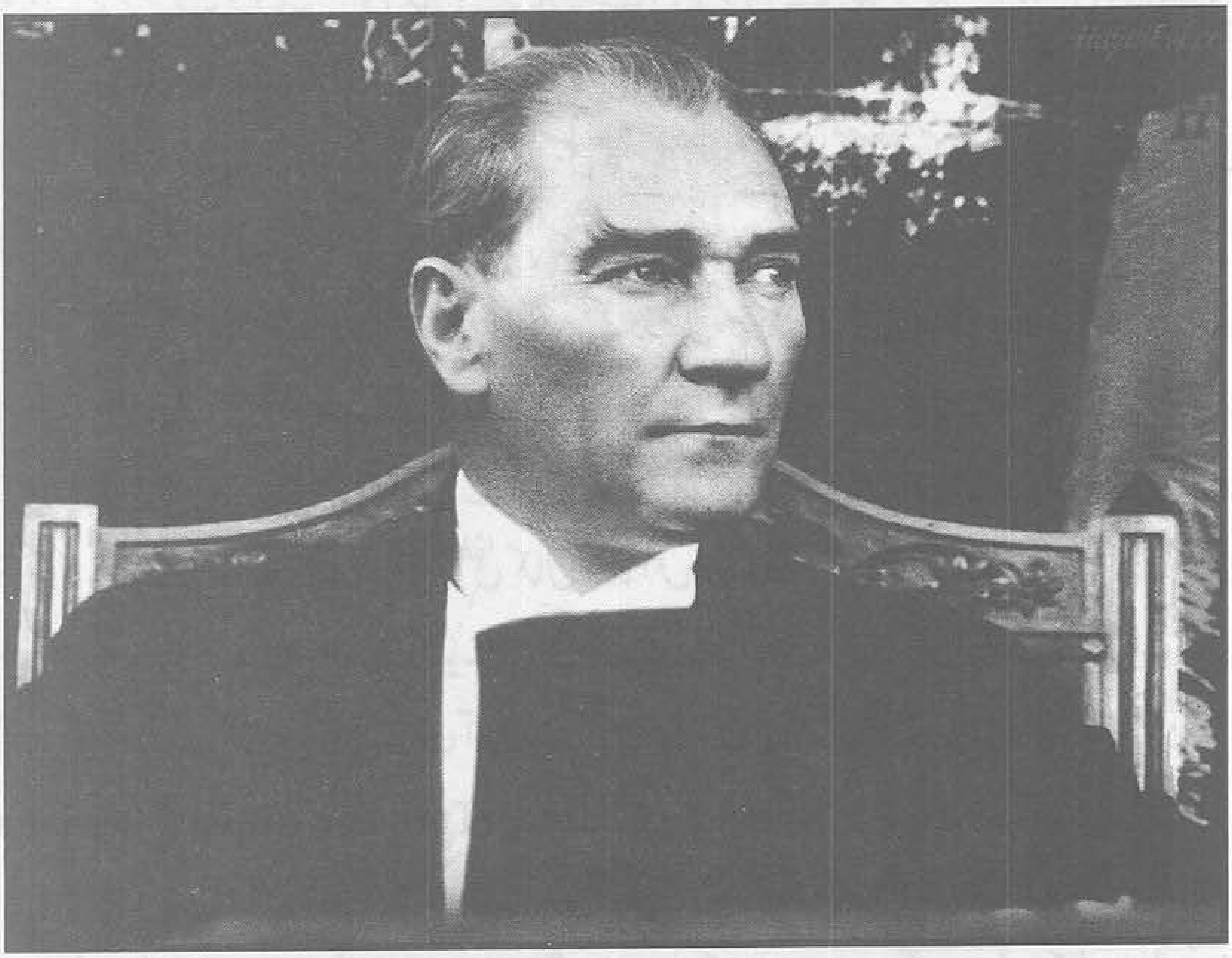


میں بھیجا۔ کچھ عرصہ انہوں نے مذہبی تعلیم حاصل کی مگر بعدازاں وہ سمسی (Semsi) سکول میں داخل ہو گئے جہاں سیکولر تعلیم دی جاتی تھی۔ مصطفیٰ کمال کے والدین کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا تجارت کے شعبہ میں تعلیم یافتہ ہوں لیکن مصطفیٰ کمال فوجی افسر بننا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے 1893ء میں ملٹری کے ایک جونیئر ہائی سکول میں داخلہ لے لیا جبکہ 1896ء میں وہ ماناستر (Manastir) شہر جو اس وقت سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھا مگر آج کل وہ میسڈونیہ (Macedonia) کا شہر بی ٹولہ (Bitola) کہلاتا ہے میں واقع ملٹری ہائی سکول میں داخل ہو گئے۔ 1899ء میں مصطفیٰ کمال Constantnople میں واقع War College میں داخل ہوئے اور 1902ء میں انہوں نے وہاں سے گریجوایشن کر لی۔ 11 / جنوری 1905ء میں انہوں نے War Acadmey سے گریجوایشن کی ڈگری حاصل کی۔ گریجوایشن کے بعد کمال اتاترک کو لیفٹیننٹ کے عہدہ پر تعینات کر کے دمشق بھیج دیا گیا وہاں انہوں نے خفیہ طور پر اصلاح پسند افسران کی تنظیم مدر اینڈ لبرٹی (Mother and Liberty) میں شمولیت اختیار کر لی۔ 1907ء میں کمال اتاترک کو کیپٹن کے عہدہ پر ترقی دے کر ماناستیر (Manastir) تعینات کر دیا گیا۔ یہاں انہوں نے نوجوان ترکوں کی تنظیم کمیٹی آف یونین اینڈ پراگرس Committee of Union and Progress میں شمولیت اختیار کی۔ 1908ء میں انہوں نے ینگ ترک ریولیوشن Young Turk Revolution کے پلیٹ فارم پر اہم کردار ادا کیا جس نے عبداللہ حمید دوئم سے اقتدار چھین لیا۔ 1910ء میں انہوں نے فرانس میں فوجی خدمات سرانجام دیں۔ 1911ء میں انہوں نے وزارت دفاع میں مختصر عرصہ کے لئے خدمات سرانجام دیں۔ 1911ء میں ہی انہیں سلطنت عثمانیہ کے ایک صوبہ طرابلس گارپ جو آج کل لیبیا کہلاتا ہے میں تعینات کر دیا گیا تاکہ وہ Halo-Turkish War میں حصہ لے سکیں۔ 1912ء میں وہ واپس دارالحکومت آئے۔ جب بالکن (Balkan) جنگوں کا آغاز ہوا تو پہلی بالکن جنگ میں انہوں نے بلغارین فوج کا مقابلہ کیا۔ 1913ء میں انہیں ملٹری اتاشی بنا کر صوفیہ Sofia بھیج دیا گیا 1914ء میں مصطفیٰ کمال کو لیفٹیننٹ کرنل کے عہدہ پر ترقی دے دی گئی۔

1914ء میں پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا اور سلطنت عثمانیہ کو اس جنگ میں بہت سے محاذوں پر اپنا دفاع کرنا پڑا۔ مصطفیٰ کمال نے اس جنگ میں اپنے ملک اور قوم کے لئے مختلف پوزیشنوں اور مختلف ممالک میں بہترین جنگی خدمات سرانجام دیں اور مختلف محاذوں پر دشمنوں کو زبردست شکست سے دوچار کیا۔ مگر حکمرانوں کی غلط حکمت عملی کے باعث سلطنت عثمانیہ کو پہلی جنگ عظیم میں بڑی



کمال اتاترک پہلی جنگ عظیم کے دوران ایک محاذ پر



شکست کا سامان کرنا پڑا اور اس کے بہت بڑے علاقہ پر دشمنوں نے قبضہ کرلیا سلطنت عثمانیہ کی فوج میں مصطفیٰ کمال کی آخری ڈیوٹی سلطنت کی شکست خوردہ بکھری ہوئی فوج کو دوبارہ منتظم کرنا تھا۔ 13 رنومبر 1918ء کو مصطفیٰ کمال اپنے مقبوضہ دارالحکومت استنبول واپس آئے۔ برطانیہ، فرانس، اٹلی اور یونانی فوجوں نے سلطنت عثمانیہ کے مختلف علاقے آپس میں بانٹ لئے۔ استنبول اور ازمیر پر بھی قبضہ ہوگیا جو مصطفیٰ کمال اور ترک قوم کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ اس کے ردعمل کے طور پر ٹرکش نیشنل موومنٹ اور ٹرکش وارز آف انڈیپنڈس کا آغاز ہوا جس کی قیادت کمال اتاترک نے اپنے پاس رکھی۔ 19 مئی 1919ء کو کمال اتاترک سیمسن (Samsun) پہنچے۔ اُن کا پہلا مقصد قابض فوجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک منظّم موومنٹ شروع کرنا تھا۔ 8 جولائی 1919ء کو انہوں نے عثمانیہ فوج سے استعفیٰ دے دیا جس پر عثمانیہ حکومت نے مصطفیٰ کمال کے لئے سزائے موت کا اعلان کرکے اُن کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔

مصطفیٰ کمال نے حکومت سے مطالبہ کر دیا کہ وہ نئی پارلیمنٹ کے قیام کے لئے انتخابات کروائے۔ 12 رفروری 1920ء کو عثمانیہ پارلیمنٹ کا آخری اجلاس ہوا۔ اس پارلیمنٹ کو برطانوی فوج نے برطرف کر دیا۔ مصطفیٰ کمال نے پارلیمنٹ کی برطرفی کے بعد گرینڈ نیشنل اسمبلی (CNA) کے قیام کا اعلان کر دیا۔

23 راپریل 1920ء کو گرینڈ نیشنل اسمبلی کا پہلا اجلاس ہوا۔ مصطفیٰ کمال نے بطور سپیکر اسمبلی اجلاس میں شرکت کی۔

10 راگست 1920ء کو عثمانیہ حکومت کے وزیراعظم دامت فرید پاشا (Damat Ferid Pasha) نے قابض قوتوں کے ساتھ ایک معاہدہ پر دستخط کر دیئے جس کے نتیجہ سلطنت عثمانیہ کو مختلف حصوں میں تقسیم کرکے قابض قوتوں کے حوالے کرنا تھا۔ اس معاہدہ میں اُن علاقوں کا بھی ذکر تھا جو ترکی کا دل سمجھے جاتے تھے۔ لہٰذا مصطفیٰ کمال نے اس معاہدہ کو مسترد کر دیا اور ترکی کی آزادی کی جدوجہد شروع کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس مقصد کے لئے گرینڈ نیشنل اسمبلی کے ذریعے ایک نیشنل آرمی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ نیشنل آرمی نے تین محاذوں پر قابض فوجوں کا مقابلہ کیا یہ تین محاذ Greco-Turkush, Framco-Turkish اور Turkish Amercan جنگ کے تھے۔

5 راگست 1921ء کو کمال اتاترک نے نیشنل آرمی کے کمانڈر انچیف کا عہدہ سنبھال لیا اور یونانی فوج کے خلاف 23 راگست سے 13 رستمبر 1921ء تک زبردست جنگ ہوئی بالآخر یونانی فوج

کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اگست 1922ء کو کمال اتاترک نے جنگ کا دائرہ وسیع کر دیا اور قابض فوجوں پر زبردست حملے شروع کر دیئے۔ 10 ستمبر 1922ء کو مصطفیٰ کمال نے لیگ آف نیشنز (League of Nations) کو ایک ٹیلی گرام کے ذریعے مطلع کیا کہ ترک قوم کے حوصلے عظیم ہیں اور وہ اپنی آزادی کے لئے کسی حد تک بھی جا سکتی ہے۔

21 نومبر 1922ء کو کانفرنس آف لوسان (Conference of Lasanme) شروع ہوئی جس کا مقصد مسائل کا حل جنگ کی بجائے مذاکرات سے نکالنا تھا۔ ترکی کے نمائندہ عصمت انونو (Asmat Inonu) نے بڑی جرأت سے ترکی کی حاکمیت اعلیٰ (Sovereignty) کا دفاع کیا اور کسی قسم کی مصلحت پسندی کو قبول نہ کیا۔ بالآخر 24 جولائی 1923ء کو معاہدہ لوسان (Treaty of Lausane) پر دستخط ہو گئے اور اس کے نتیجہ میں 29 اکتوبر 1923ء کو آزاد ریپبلک آف ترکی کے قیام کا باضابطہ اعلان ہو گیا۔

مصطفیٰ کمال کی نجی زندگی زیادہ خوشگوار نہیں گزری۔ انہوں نے 29 جنوری 1923ء میں Latif Usakhgil نامی خاتون سے شادی کی مگر 5 اگست 1925ء کو دونوں کے درمیان طلاق ہو گئی۔ بعدازاں مصطفیٰ کمال نے زندگی بھر شادی نہیں کی۔ مصطفیٰ کمال کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی البتہ انہوں نے سات بیٹیوں اور ایک بیٹے کو اپنایا اور ان کی پرورش کی۔ اپنے فارغ وقت میں وہ کتابوں کا مطالعہ کرتے، گھوڑسواری اور تیراکی کرتے۔ 1937ء میں ان کی صحت گرنے لگی۔ 1938ء کے آغاز میں جب وہ (Yalova) کے دورہ پر تھے وہ سخت بیمار پڑ گئے انہیں علاج کے لئے استنبول لایا گیا جہاں ڈاکٹروں کو معلوم ہوا کہ ان کا جگر خراب ہو گیا ہے۔ اس بیماری کے باعث وہ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکے اور 10 نومبر 1938ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔

کمال اتاترک کی بطور سربراہ مملکت اپنے ملک اور قوم کے لئے خدمات کا ذکر کیا جائے وہ ان گنت ہیں۔ انہوں نے اپنے ملک میں قابل تقلید سیاسی، اقتصادی اور سماجی اصلاحات کیں۔ جدید رجحانات کے مالک کمال اتاترک نے سابق سلطنت عثمانیہ کو ایک جدید اور قوموں کی برادری میں ایک مضبوط اور باوقار ملک بنا دیا۔ وہ اپنے ملک کی مکمل آزادی کی داعی تھے انہوں نے اپنی ایک تقریر میں مکمل آزادی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''ملک آزادی سے ہمارا مطلب مکمل اقتصادی، مالی، فوجی، سماجی، جوڈیشل اور تمام دیگر معاملات میں فریڈم ہے اگر ہمیں ان میں کسی ایک چیز سے بھی محروم کیا جاتا ہے تو ہم سمجھیں گے کہ ہمیں ہر قسم کی آزادی سے محروم کر دیا گیا ہے'' کمال اتاترک نے

اپنی تمام زندگی ترک قوم کو مکمل آزادی سے ہمکنار رکھنے کی کوشش کی۔ وہ عوام کی حاکمیت پر مکمل یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے ملک کو ایک مستحکم سیاسی نظام دیا۔ 1924ء کے آئین میں مقننہ کو انتظامیہ سے الگ کر دیا۔ 925`1ء میں انہوں نے ملک میں یک جماعتی نظام متعارف کروایا اور ملک کی واحد پارٹی کو پیپلز پارٹی کا نام دیا گیا جس کے سربراہ خود کمال اتاترک تھے بعدازاں اس کا نام ریپبلکن پیپلز پارٹی رکھ دیا گیا۔

3/ مارچ 1924ء کو ترکی سے خلافت ختم کر دی گئی اور خلافت کے تمام اختیارات گرینڈ نیشنل اسمبلی کو منتقل کر دیئے گئے۔ خلافت کی بحالی کے لئے 1926ء کو مکہ اور 1931ء میں بیت المقدس میں بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد کی گئیں۔ ہندوستان میں بھی مسلمانوں نے تحریک خلافت چلائی مگر کمال اتاترک نے خلافت کی بحالی کو کبھی قبول نہیں کیا۔ وہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھنے کے قائل تھے۔ 1925ء کے آغاز میں کمال اتاترک نے اپنی قوم کو یورپی لباس پہننے کی تلقین کی۔ وہ مشرقِ وسطیٰ کے روایتی لباس کو تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ 1925ء میں ہی Hat Law متعارف کرایا گیا جس میں پگڑی یا ٹوپی کی بجائے ہیٹ پہننے کی ترغیب دی گئی اور کمال اتاترک نے خود ہیٹ پہن کر عوامی اجتماعات میں شریک ہونے کو ترجیح دی۔ اپنی قوم کو ماڈرن لباس زیب تن کروانے کے لئے انہوں نے 1934ء میں ایک قانون متعارف کرایا جسے Law Retating to Prohitbited Garments کا نام دیا گیا۔ 2/ ستمبر 1925ء کو کمال اتاترک نے صوفی ازم کی تشہیر کرنے پر پابندی عائد کر دی۔ 1926ء میں کمال اتاترک کو ازمیر میں قتل کرنے کی ایک سازش کا انکشاف ہوا۔ کمال اتاترک کے سابق ساتھی احمد سکرو Ahmed Sukru اور اسماعیل کینبولات Ismail Canbulat کو سازش کا مجرم قرار دیتے ہوئے ان پر مقدمہ چلایا گیا اور انہیں پھانسی دے دی گئی۔ یکم مارچ 1926ء کو ٹرکش پینل کوڈ Turkish Penal Code پاس کیا گیا جو اطالوی پینل کوڈ سے مطابقت رکھتا تھا اس کے نتیجہ میں 4 اکتوبر 1926ء کو اسلامی عدالتیں ختم کر کے سول عدالتیں قائم کی گئیں اس کے علاوہ خواتین کو وراثت اور طلاق کے معاملات میں مردوں کے برابر حقوق دے دیئے گئے۔ کمال اتاترک چاہتے تھے کہ ملک کی تعمیر و ترقی میں مرد اور خواتین برابر کے شریک ہوں۔ 1927ء میں ثقافت اور مجسمہ سازی کے فروغ کے لئے اتاترک کے حکم پر انقرہ میں State Art and Sculpture Museum قائم کیا گیا۔ نومبر 1928ء میں کمال اتاترک نے ترکی زبان کو عربی رسم الخط میں لکھنے کی بجائے رومن رسم الخط میں لکھنے کے احکامات جاری کیئے۔ اس

اقدام کا مقصد ترکی کے عوام کی سوچ میں جدت اور ترقی یافتہ ممالک سے قربت پیدا کرنا تھا۔

نئے رسم الخط کے ساتھ پہلا اخبار 15 / دسمبر 1928ء کو شائع ہوا۔ 1932ء میں ملک بھر میں پیپلز ہاؤس قائم کئے گئے۔ بزرگ مردوں اور عورتوں کو یہ پیپلز ہاؤس مدد فراہم کرتے تھے۔ کمال اتاترک نے پرائمری سکولوں میں تعلیم دینے کے لئے جدید طریقے بھی متعارف کروائے۔ انہوں نے ملک میں تعلیم بالغاں کا بھی اہتمام کیا تاکہ ان پڑھ افراد تعلیم حاصل کر کے ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لے سکیں۔ 11 / اگست 1930ء کو کمال اتاترک نے ملک میں کثیر الجماعتی نظام متعارف کرایا جس کے نتیجہ میں لبرل ریپبلکن پارٹی کا وجود عمل میں آیا۔ اس پارٹی نے کمال اتاترک کی اصلاحات کی مخالفت میں پراپیگنڈہ مہم شروع کر دی۔ اس پارٹی کو عوامی پذیرائی حاصل نہ ہو سکی اور اس کا وجود ختم ہو گیا۔ 1931ء میں اتاترک نے ٹرکش لینگوئج ایسوسی ایشن Turkish Lanuguage Association اور Turkish Historical Society قائم کر دی۔ 1933ء میں اتاترک نے استنبول یونیورسٹی کی وسعت کے احکامات جاری کئے جبکہ دارالحکومت انقرہ میں انقرہ یونیورسٹی قائم کی۔ 5 / دسمبر 1934ء کو کمال اتاترک نے خواتین کو مکمل سیاسی حقوق دے دیئے۔ اس وقت تک یورپ کے بیشتر ممالک میں خواتین کو یہ حقوق حاصل نہ تھے۔ 1935ء کے عام انتخابات میں 18 خواتین پارلیمنٹ کی رکن منتخب ہو گئیں۔

خارجہ پالیسی کے حوالے سے کمال اتاترک کا نظریہ تھا Peace at home and peace in the world۔ نیز ہر شعبہ میں کمال اتاترک نے بہترین نظریات پیش کئے اور بہترین طرز عمل اپنایا۔ اسی لئے ترک قوم اپنے اس عظیم قائد کو آج بھی ہر لمحہ یاد کرتی ہے۔ ترکی کے تقریباً ہر شہر میں کمال اتاترک کے مجسمے نصب ہیں اور ہر دفتر اور تقریباً ہر گھر میں ان کی تصویر موجود ہے۔ ترکی میں بہت سے اہم مقامات ان کے نام سے منسوب ہیں مثلاً استنبول میں اتاترک انٹرنیشنل ائیرپورٹ، گولڈن ہام کے اوپر اتاترک برج Ataturic Bridge، اتاترک ڈیم اور اتاترک اسٹیڈیم وغیرہ۔ دنیا بھر میں بھی اتاترک کو عظیم لیڈر کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ 1981ء میں کمال اتاترک کی 100 ویں برسی کے موقع پر اقوام متحدہ اور یونیسکو نے 1981ء کو دنیا بھر کے لئے اتاترک کا سال قرار دیا اور ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے باضابطہ طور پر ایک اقرارداد منظور کی۔ کمال اتاترک ایسے لیڈر قوموں کی زندگی میں کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔

اڈولف ہٹلر

(ADOLF HITLER)

جرمنی کا عظیم مگر متنازعہ لیڈر

دوسری جنگ عظیم کے مرکزی کردار ہٹلر کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ دنیا میں ان کے مخالفین کی تعداد شاید ان کے حامیوں سے کہیں زیادہ ہے مگر تاریخ کی کتابوں میں بیسویں صدی کے قائدین کی فہرست میں ان کا نام خارج نہیں کیا جاسکتا۔ اُن کی زندگی پر اچھے یا بُرے الفاظ میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور ہر زبان میں اُن کے کارناموں یا جرائم پر فلمیں بھی بنائی اور چلائی گئی ہیں۔

ہٹلر جن کا پورا نام اڈولف ہٹلر تھا، 20/اپریل 1889ء میں آسٹریا (Austria) کے قصبہ Braunau-am-Inn میں پیدا ہوئے۔ یہ قصبہ آسٹریا اور جرمنی کے بارڈر پر واقع تھا اور ہٹلر کے والد اولس (Alors) بارڈر کراسنگ پر کسٹم آفیسر تھے۔ ہٹلر کی والدہ کلارا (Klara) نے ہٹلر سے قبل دو بچوں کو جنم دیا مگر دونوں پیدائش کے وقت ہی فوت ہو گئے۔ ہٹلر نے چھ سال کی عمر میں سکول جانا شروع کیا۔ ہٹلر کے بعد اُس کا ایک بھائی ایڈمنڈ (Admund) پیدا ہوا مگر وہ بھی چھ سال کی عمر میں فوت ہو گیا البتہ 1896ء میں پیدا ہونے والی ہٹلر کی بہن Paula ہٹلر کی وفات کے بعد بھی کافی عرصہ تک زندہ رہی۔

ہٹلر سکول میں اچھا طالبعلم نہ تھا اور آرٹسٹ بننے کے شوق میں تعلیم ادھوری چھوڑ دی۔ جب ہٹلر 13 برس کا تھا تو اُس کے والد ''اولس'' انتقال کر گئے اور والدہ کو ہی ہٹلر اور اُس کی بہن پولا کی پرورش کرنا پڑی۔ 16 سے 19 برس کی عمر میں ہٹلر نے نہ تو پڑھائی میں زیادہ دلچسپی لی اور نہ ہی روزگار کا کوئی ذریعہ تلاش کیا بلکہ سیاست اور تاریخ میں اُس کی زبردست دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس



دوران ہٹلر نے ویانہ اکیڈمی کے فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ میں داخلہ حاصل کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوسکی۔

جب ہٹلر کی عمر 19 برس ہوئی تو اس کی والدہ کلارا کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر وفات پا گئیں۔ والدہ کے چلے جانے کے بعد خاندان میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو ہٹلر اور اُس کی بہن کی مدد کر سکے لٰہذا 1909ء میں ہٹلر وفیانا چلا گیا تا کہ کوئی روزگار تلاش کر سکے۔ ایک سال تک ہٹلر بے گھر افراد کے لئے بنائے گئے شیلٹرز (Shelters) میں رہا۔ اُسے کوئی مستقل نوکری نہ مل سکی اور اپنا گزارہ پارٹ ٹائم کام کر کے کیا کرتا۔

1913ء میں ہٹلر جنوبی جرمنی کے شہر میونخ چلا گیا۔ 1914ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوگئی تو ہٹلر نے رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات جرمن فوج کے لئے پیش کر دیں جسے قبول کرتے ہوئے 16ویں باوازیاں Bavazian ریزور جمنٹ میں شامل کر لیا گیا۔ ہٹلر جنگ میں بڑی جوانمردی سے لڑا جس پر اُس کو نان کمشنڈ آفیسر کے عہدہ پر ترقی مل گئی۔

1918ء میں جب دوسری جنگ عظیم کے اختتام کا اعلان ہوا اُس وقت ہٹلر ایک ہسپتال میں زیر علاج تھا۔ جنگ کے دوران برطانوی فوج کے حملہ کے دوران اُس کی آنکھوں کی بینائی چلی گئی تھی۔ علاج کے بعد وہ واپس اپنی رجمنٹ میں چلا گیا۔

دسمبر 1918ء سے ایک مارچ 1919ء تک ہٹلر جنگی قیدیوں کے ایک کیمپ میں خدمات سرانجام دیتا رہا۔ میونخ واپس آنے پر اُس نے دیکھا کہ کمیونسٹوں کے ایک گروپ نے حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی جسے فوج نے ناکام بنا دیا۔ جب ہٹلر نے تحقیقات کے دوران کمیونسٹوں کے خلاف گواہی دی تو اُسے دعوت دی گئی کہ وہ مقامی فوج میں شامل ہو جائے جس کا کام سابق فوجیوں کو کمیونسٹ کے اثرات سے دور رکھنا تھا۔ اس کام کو سرانجام دینے کے دوران ہٹلر کی تقریر کرنے اور دوسروں کو قائل کر لینے کی صلاحیت بڑھ گئی۔ فوجی ڈیوٹی کے دوران اُس کے فرائض میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ مقامی سیاسی گروپوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھے اور اُن کے اجلاسوں میں بھی شرکت کرے۔ ایک روز جرمن ورکرز پارٹی کے ایک اجلاس کے دوران ایک مقرر کی تقریر کے جواب میں ہٹلر نے بھی دھواں دار تقریر کر ڈالی۔ ورکرز پارٹی کے بانی Anion Drexler ہٹلر کی تقریر سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے ہٹلر کو اپنی پارٹی میں شمولیت کی دعوت دے دی۔ ہٹلر نے یہ دعوت قبول کر لی اور ستمبر 1919ء میں وہ ورکرز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ پارٹی میں انہیں پبلسٹی اور پروپیگنڈہ کی



ہٹلر اپنی افواج سے خطاب کرتے ہوئے



ہٹلر اہم جرمن فوجی جرنیلوں کے ہمراہ

ذمہ داری سونپی گئی۔ ایک ماہ بعد ہی وہ ایک سو سے زائد افراد کا ایک اجلاس منعقد کرنے میں کامیاب ہو گئے جہاں انہوں نے اپنی زندگی کی پہلی سیاسی تقریر کی۔ فروری 1920ء میں میونخ میں دو ہزار سے زیادہ افراد پر مشتمل جلسہ کیا جہاں انہوں نے اپنی پارٹی کا 25 نکاتی پروگرام جاری کیا۔ یکم اپریل 1920ء کو ورکرز پارٹی کا نام تبدیل کر کے ''نیشنل سوشلسٹ جرمن ورکرز پارٹی'' یا مختصر الفاظ میں ''نازی'' پارٹی رکھ دیا گیا۔

فروری 1921ء میں ہٹلر کی سیاسی تقاریر پر انہیں فوج سے برطرف کر دیا گیا۔ اب ہٹلر نے اپنی توجہ پارٹی کے اندر اپنا اثر و رسوخ بڑھانے پر مرکوز کی۔ پارٹی میں انہوں نے اپنے ہم خیال پرجوش نوجوانوں کا ایک گروپ قائم کیا جس کا کام اپنی پسند کے خلاف ہونے والے پارٹی کے اجلاسوں کو درہم برہم کرنا تھا۔ بہت جلد ہٹلر نے پارٹی کے اندر اپنی جڑیں مضبوط کر لیں اور سینٹرل کمیٹی کے ممبران کو مجبور کر دیا کہ وہ اُسے پارٹی کا مرکزی لیڈر تسلیم کریں۔

1921ء کے آخر تک ہٹلر نے نازی پارٹی پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیا مگر نازی پارٹی کے بہت سے ممبران ہٹلر کو دل سے پسند نہیں کرتے تھے۔ جولائی 1921ء کو جب ہٹلر برلن گیا ہوا تھا تو نازی پارٹی کے ناراض لیڈروں نے کوشش کی کہ نازی پارٹی کو ایک ہم خیال سیاسی جماعت میں مدغم کر دیا جائے تاکہ ہٹلر کا اثر کم ہو سکے۔ جب ہٹلر کو اس بارے میں پتہ چلا تو وہ فوراً واپس میونخ چلا گیا اور حالات کو کنٹرول کر لیا۔

نومبر 1923ء تک ہٹلر نے نازی پارٹی کو خاصا مضبوط کر لیا۔ 8 نومبر 1923ء کو ہٹلر نے مقامی باوارین گورنمنٹ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنے جنگجو ساتھیوں کی مدد سے باوارین حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں کو اغوا کر کے میونخ کے Beer Hall میں بند کر دیا اور حکومت پر قبضہ کرنے کا اعلان کر دیا مگر بالآخر یہ کوشش ناکام رہی۔ اس ناکام کوشش پر ہٹلر کو گرفتار کر لیا گیا اور اُس پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا اور اُسے پانچ سال قید کی سزا سنائی گئی۔ لیکن چھ ماہ بعد دسمبر 1924ء میں اُسے رہا کر دیا گیا۔ اس زمانے میں نازی پارٹی سے تعلق رکھنے والے اخبارات پر حکومت نے پابندی عائد کر رکھی تھی۔ خود ہٹلر کی نقل و حرکت اور تقریر کرنے پر پابندی تھی۔ ہٹلر کی جماعت کی عوامی حمایت میں بھی کافی کمی آ گئی۔ 1928ء تک اُس کے ممبران کی تعداد 20 لاکھ سے کم ہو کر آٹھ لاکھ دس ہزار رہ گئی۔ تاہم ہٹلر نے اپنے دست راست جارج سٹراسر (George Strasser) کی مدد سے نازی پارٹی کی ممبر شپ میں خاطرہ خواہ اضافہ کر لیا اُس دور میں ہٹلر نے

اپنے باڈی گارڈز پر مشتمل تنظیم ایس ایس قائم کر لی۔

1929ء میں جب امریکہ میں اقتصادی بحران آیا تو جرمنی کی معیشت پر بھی اُس کے بہت برے اثرات مرتب ہوئے۔ تمام غیر ملکی امداد بند ہوگئی۔ کارخانے بند ہونے لگے اور لاکھوں لوگ بے روزگار ہو گئے۔ یہ حالات ہٹلر اور نازی پارٹی کے لئے سودمند ثابت ہوئے۔ اگلے برس جولائی تک چانسلر بروے ننگ (Chancellor Bruening) کی حکومت پارلیمنٹ میں کمزور ہونے کے باعث نیا فنانس بل پاس کروانے میں ناکام رہی اور اُسے پریذیڈنٹ ہنڈن برگ سے درخواست کرنا پڑی کہ وہ اسمبلی تحلیل کر کے ملک میں نئے انتخابات کروائیں۔ ہٹلر نے ملک بھر میں نازی پارٹی کے امیدواروں کے لئے زبردست مہم چلائی اور انتخابات میں نازی پارٹی کو ساٹھ لاکھ چالیس ہزار ووٹ مل گئے۔ اس طرح نازی پارٹی پارلیمنٹ میں دوسری بڑی جماعت بن گئی۔ اس کامیابی کے بعد ہٹلر کو فوج اور صنعتکاروں کی حماعت حاصل کرنے میں سہولت حاصل ہو گئی۔ صنعتکاروں نے نازی پارٹی کی بھرپور مالی معاونت شروع کر دی۔

فروری 1932ء میں ہٹلر نے صدارتی انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا اور آنے والے الیکشن میں صدر ہائیڈن برگ کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ چونکہ اس وقت تک ہٹلر نے جرمن شہریت حاصل نہ کی تھی اور صدارتی امیدوار بننے کے لئے جرمن شہری ہونا ضروری تھا لہٰذا انہوں نے 25/ فروری 1932ء کو جرمن شہریت حاصل کر لی۔ 13/ مارچ 1932ء کو صدارتی انتخابات منعقد ہوئے۔ ہٹلر کو اگرچہ اچھے ووٹ مل گئے مگر ہائیڈن برگ دوبارہ صدر منتخب ہو گئے اور ہٹلر کو اگلے موقع کا انتظار کرنا پڑا۔ جولائی 1932ء میں ہونے والے پارلیمنٹ کے الیکشن میں نازی پارٹی سب سے بڑی جماعت کے طور پر سامنے آئی مگر حکومت بنانے کے لئے اُسے واضح اکثریت حاصل نہ تھی۔ ہٹلر نے مطالبہ کیا کہ اُسے چانسلر بنایا جائے مگر اکثریت نہ ہونے کے باعث یہ مطالبہ پورا نہ ہوا البتہ ہٹلر وائس چانسلر بننے میں کامیاب ہو گئے۔

پارلیمنٹ میں کسی پارٹی کی واضح اکثریت نہ ہونے کے باعث مستحکم حکومت نہ بن سکی اور کوئی بھی چانسلر حالات پر قابو نہ پا سکا۔ ادھر ہٹلر نے سیاسی جوڑ توڑ جاری رکھا۔ بالآخر 30/ جنوری 1933ء کو صدر ہائیڈن برگ نے ہٹلر کو جرمنی کا چانسلر نامزد کر دیا۔

27/ فروری 1933ء کو جرمن تاریخ کا انتہائی اہم واقعہ پیش آیا جب جرمن پارلیمنٹ کو آگ لگا کر خاکستر کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے یہ آگ نازی پارٹی نے لگائی لیکن پروپیگنڈہ مہم کے ذریعے

کمیونسٹ پارٹی کو ملزم ٹھہرا دیا گیا۔ اس الزام کے تحت چانسلر ہٹلر کو موقع مل گیا کہ وہ اپنے سیاسی مخالفین کا خاتمہ کر سکے لہٰذا موقع کا بھرپور فائدہ اٹھایا گیا اور پارلیمنٹ کے تمام کمیونسٹ ممبران کو گرفتار کر لیا گیا علاوہ ازیں سیاسی مخالفین پر ہر طرح کی پابندی عائد کر دی گئی۔ لیکن ان سب کارروائیوں کے باوجود 5 مارچ 1933ء کو منعقد ہونے والے عام انتخابات میں نازی پارٹی کو واضح اکثریت حاصل نہ ہو سکی۔ نازی پارٹی کی خواہش تھی کہ جرمن آئین میں تبدیلی لائی جائے اور چانسلر کو زیادہ اختیارات سونپے جائیں مگر اس کے لئے پارلیمنٹ میں دو تہائی اکثریت کی ضرورت تھی جو کہ نازی پارٹی کے لئے حاصل کرنا ناممکن تھا۔ لہٰذا نیا طریقہ اپنایا گیا۔

23/ مارچ 1933ء کو Enabling Act کے عنوان سے ایک بل پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا گیا جس کا مقصد قانون سازی کے اختیارات پارلیمنٹ سے لے کر ہٹلر کی کابینہ کو ٹرانسفر کرنے تھے۔ اس بل کے لئے مطلوبہ دو تہائی اکثریت سنٹر اور نیشنلسٹ پارٹیوں کی مدد سے حاصل کر لی گئی اور بل پاس ہو گیا۔ یہاں سے ہٹلر کی ڈکٹیٹر شپ کا آغاز ہوا۔ 14/ جولائی 1933ء کو ہٹلر نے ایک قانون نافذ کیا جس کے تحت نازی پارٹی کو جرمنی کی واحد سیاسی جماعت قرار دے دیا گیا اس کے علاوہ تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد کر دی گئی۔ ٹریڈ یونین بھی خلاف قانون قرار دے دی گئی۔ جرمنی کے زیر انتظام تمام خود مختار ریاستوں کی خود مختاری ختم کر کے وہاں نازی پارٹی کی اقتدار پر گرفت مضبوط ہو گئی تو انہوں نے ہر شعبہ میں اپنی اجارہ داری قائم کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز حربہ اختیار کرنا شروع کر دیا۔ صدر ہائیڈن برگ اور فوجی جرنیل اس صورت حال سے پریشان ہو گئے اور انہوں نے ہٹلر پر زور دیا کہ وہ اپنی تنظیموں پر کنٹرول کریں بصورت دیگر ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا جائے گا۔ ہٹلر نے حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے 30/ جون 1934ء کو ایسے تمام فسادی افراد کا قلع قمع کرنے کا حکم دے دیا۔ نیشنل پولیس کے ذریعے لاتعداد لوگوں کو گرفتار کیا گیا یا قتل کر دیا گیا۔

2/ اگست 1934ء کو صدر ہائیڈن برگ کا انتقال ہو گیا۔ ہٹلر نے پہلے ہی کابینہ سے منظوری لے لی ہوئی تھی کہ ہائیڈن برگ کی وفات کے بعد صدر اور چانسلر کا عہدہ یکجا کر دیا جائے گا۔ عوام کی رائے معلوم کرنے کے لئے ایک ریفرنڈم کروا دیا گیا جس میں 90 فیصد عوام نے اس تبدیلی کے حق میں ووٹ دے دیا اس طرح ہٹلر نے جرمنی میں صدارت کا عہدہ ختم کر کے خود کو ایک مضبوط چانسلر بنا لیا۔ ہٹلر کو فوج کی بھی مکمل حمایت حاصل تھی۔

1934ء سے 1937ء کے دوران ہٹلر نے جرمنی کو فوجی لحاظ سے ایک مضبوط طاقت بنانے پر اپنی ساری توجہ مرکوز کر دی۔ انہوں نے پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر جنگ بندی کے لئے ہونے والے معاہدہ Versaelles Treaty کے تحت جرمنی پر لگائی گئی پابندیوں سے جرمنی کو آزاد سمجھ لیا اور فوجی ہتھیاروں کی تیاری شروع کر دی اور اس مقصد کے لئے تمام وسائل بروئے کار لائے گئے۔ 1936ء میں ہٹلر کے ایک اہم ساتھی Goering کو خصوصی ٹاسک دی گئی جس نے ایک چار سالہ منصوبہ ترتیب دیا جس کے تحت جرمنی کو آئندہ چار سال کے اندر ہر لحاظ سے خود کفیل بنانا تھا۔ ہٹلر پر یہ بھی الزام ہے کہ اُس کے دور میں شہریوں کی آزادیاں مکمل طور پر ختم کر دی گئیں تھیں۔ پریس پر سنسر شپ عائد کر دی گئی۔ ٹریڈ یونینز اور اسٹوڈنٹس یونینز کو ختم کر دیا گیا اور یہودیوں پر بطور خاص ظلم و جبر کیا گیا۔ ہٹلر کی بنائی ہو؟ ئی خفیہ تنظیم گستاپو ظلم و بربریت کی پہچان بن گئی۔ سیاسی جرائم کے لئے خصوصی عدالتیں اور بغاوت جیسے الزامات پر مقدمات کے لئے عوامی عدالتیں متعارف کرائی گئیں۔ دونوں قسم کی عدالتیں نازی پارٹی کے کنٹرول میں تھیں۔

ہٹلر نے فوج کی تعداد میں تین گنا اضافہ کر دیا۔ ورسٹی معاہدہ کے تحت جرمنی ایک لاکھ فوج رکھ سکتا تھا مگر ہٹلر نے یہ تعداد بڑھا کر تین لاکھ کر دی۔ بڑے بحری بیڑے تیار کیئے گئے۔ ائرفورس کی صلاحیت کو کئی گنا بڑھا دیا گیا اور پائلٹ افسروں کو بڑی تعداد میں ترتیب دی گئی۔ مختصر یہ کہ جرمنی نے ہر قسم کے ہتھیاروں کے انبار جمع کر لئے اور جرمنی ایک بہت بڑی فوجی طاقت بن گیا مگر یہ کام انتہائی خفیہ طریقہ سے کیا گیا۔

25/ اکتوبر 1936ء کو جرمنی اور اٹلی کے درمیان ہر سطح پر باہمی تعاون کا معاہدہ ہو گیا اور 25/ نومبر 1936ء کو جاپان کے ساتھ بھی ہٹلر نے فوجی تعاون کا معاہدہ کر لیا۔ جاپان کے ساتھ تعلقات کو مزید وسعت دینے کے لئے ہٹلر نے نومبر 1937ء میں نیورم برگ Nuremberg میں جاپان کے شہنشاہ ہیروہیٹو (Heroheto) کے بھائی شہزادہ چیچی بو (Chichibu) سے خصوصی ملاقات کی۔

1937ء میں ہٹلر برطانوی حکومت کے سخت خلاف ہو گیا کیونکہ اس کو یقین ہو گیا کہ جرمنی کو عظیم تر بنانے کے اس کے خواب کی راہ میں برطانیہ بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ 1936ء اور 1937ء کے دوران ہٹلر پیٹ کے شدید درد میں مبتلا رہا اور اکتوبر 1937ء میں اس نے نازی پارٹی کے ایک اجلاس کے دوران اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ اس کے والدین کی زندگی بہت مختصر رہی تھی وہ اپنی جوانی میں ہی اس دنیا سے چلے گئے۔ مجھے بھی معلوم نہیں کہ زندگی کہاں تک ساتھ دیتی ہے لہٰذا میں چاہتا

ہوں کہ میں جرمنی کو ایک عظیم طاقت بنانے کے اپنے خواب کو جلد از جلد پورا کرنے کی کوشش کروں۔
5/نومبر 1937ء کو ہٹلر نے اپنے وزیر دفاع، وزیر خارجہ اور بری، بحری اور فضائی فوج کے سربراہوں کے ساتھ ریچ چانسلری (Rech Chancellory) میں ایک خفیہ ملاقات کی اور انہیں جرمنی کے مستقبل کے حوالے سے اپنی خواہش سے آگاہ کیا۔ ہٹلر نے ان تمام حضرات کو حکم دیا کہ وہ جرمن قوم اور ملک کو دنیا کی پابندیوں سے آزاد کرنے کے لئے 1943ء سے قبل سے ایک عظیم جنگ کا منصوبہ تیار کرلیں۔ ہٹلر نے انہیں یہ بھی ہدایت کہ وہ میرے الفاظ کو میری وصیت سمجھ لیں اگر اس دوران میری موت واقع ہو جائے تو میرے بعد بھی جرمن قوم کو دنیا میں عظیم تر بنانے کی میری خواہش کی تکمیل کی جائے۔ بعدازاں جب وزیر دفاع اور وزیر خارجہ نے ہٹلر کے عزائم کے حوالے سے کچھ تحفظات کا اظہار کیا تو ہٹلر سخت ناراض ہو گیا اور اس نے 4/فروری 1938ء کو وزارت دفاع ختم کر دی اور وزیر خارجہ کو برطرف کر دیا اور خود کو سپریم کمانڈر آف آرمڈ فورسز بنانے کا اعلان کر دیا۔ وزارت خارجہ کے تمام امور بھی ہٹلر نے اپنے کنٹرول میں لے لئے۔ جرمنی کی خارجہ پالیسی بھی اس نے جنگی بنیادوں کو مدنظر رکھتے ہوئے تیار کرلی۔

1938ء میں ہٹلر نے ریپبلک آف چائنہ کے ساتھ 1910ء سے قائم "Sino German" معاہدہ توڑ کر جاپان کے ساتھ دفاعی معاہدہ کرلیا۔

مارچ 1938ء میں ہٹلر نے آسٹریا کی حکومت پر دباؤ ڈالا کہ وہ جرمنی کا اتحادی بن جائے۔ 14/مارچ کو جرمن فوجوں نے باضابطہ طور پر آسٹریا کے دارالحکومت ویانا پر قبضہ کرلیا۔

28/مئی 1938ء کو منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں ہٹلر نے واضح طور پر اعلان کیا کہ اس کا اٹل فیصلہ ہے کہ وہ اکتوبر تک چیکوسلاواکیہ کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دے گا۔ 30/ستمبر 1938ء کو برطانیہ کے وزیراعظم چیمبرلین (Chamberlain) اٹلی کے وزیراعظم مسولینی (Mussolini) کو فرانس کے وزیراعظم دیلادیئر (Daledier) اور جرمنی کے چانسلر ہٹلر کے درمیان ایک روزہ کانفرنس جرمنی کے شہر میونخ میں منعقد ہوئی جس کا مقصد جنگ کے امکانات کو کم کرنا اور بات چیت کے ذریعے سرحدی معاملات طے کرنا تھا۔ اس ملاقات میں ایک معاہدہ طے پا گیا جسے میونخ معاہدہ (Munich Agreement) کا نام دیا گیا۔ اس معاہدہ کے تحت چیکوسلاواکیہ کا متنازع ضلع Sundetenland ہٹلر کے مطالبہ پر جرمنی کے حوالے کر دیا گیا۔ اب ہٹلر کی نظر پولینڈ پر تھی۔

یکم ستمبر 1939ء کو جرمن فوجوں نے مغربی پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ اس کے جواب میں برطانیہ اور

فرانس نے 3 ستمبر کو جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اس طرح باضابطہ طور پر دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا۔ بعدازاں دنیا کے تقریباً تمام ممالک اس جنگ کی لپیٹ میں آ گئے۔ 2 مئی 1945ء کو جرمن فوجوں نے برلن پر سوویت یونین کے بھرپور حملہ کے دوران غیر مشروط طور پر اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے ہتھیار پھینک دیئے۔ اس طرح دوسری جنگ عظیم کا اختتام ہو گیا۔ یکم ستمبر 1939ء سے لے کر 2 مئی 1945ء کے عرصہ کے دوران جنگ میں لاکھوں انسانی جانیں ضائع ہوئیں اور لاتعداد ممالک میں کھربوں روپے مالیت کی عمارتیں زمین بوس ہو گئیں۔ جنگ کے اختتام سے دو روز قبل جب ہٹلر کو یقین ہو گیا کہ شکست جرمنی کا مقدر بن چکی ہے تو اس نے خودکشی کر لی۔ ہٹلر نہیں چاہتا تھا کہ وہ روسی فوجوں کے ہاتھوں گرفتار ہو اور اُس پر جنگی جرائم کا مقدمہ چلے۔

اپنی موت سے دو روز قبل ہٹلر نے Eva Braun سے شادی کی۔ خودکشی کے روز دونوں میاں بیوی ایک پرائیویٹ کمرے میں گئے اور زہر آلود گولیاں کھا لیں۔ ہٹلر نے بعدازاں اپنے آپ کو گولی بھی مار لی۔ موت سے پہلے ہٹلر نے ایک وصیت تحریر کی جس میں اُس نے اپنی تمام جائداد نازی پارٹی کے نام کر دی۔

ہٹلر نے اپنے ملک جرمنی کو وسعت دینے کے لئے عظیم جنگ لڑی مگر اس کے اقدامات کے باعث جرمنی کی سرحدیں مزید سکڑ گئیں۔

ہٹلر نے مشرقی یورپ سے کمیونزم کا خاتمہ کرنے کے لئے جنگ لڑی مگر اُس کے اقدامات کے باعث پورا مشرقی یورپ کمیونزم کی لپیٹ میں آ گیا۔

نیلسن مینڈیلا

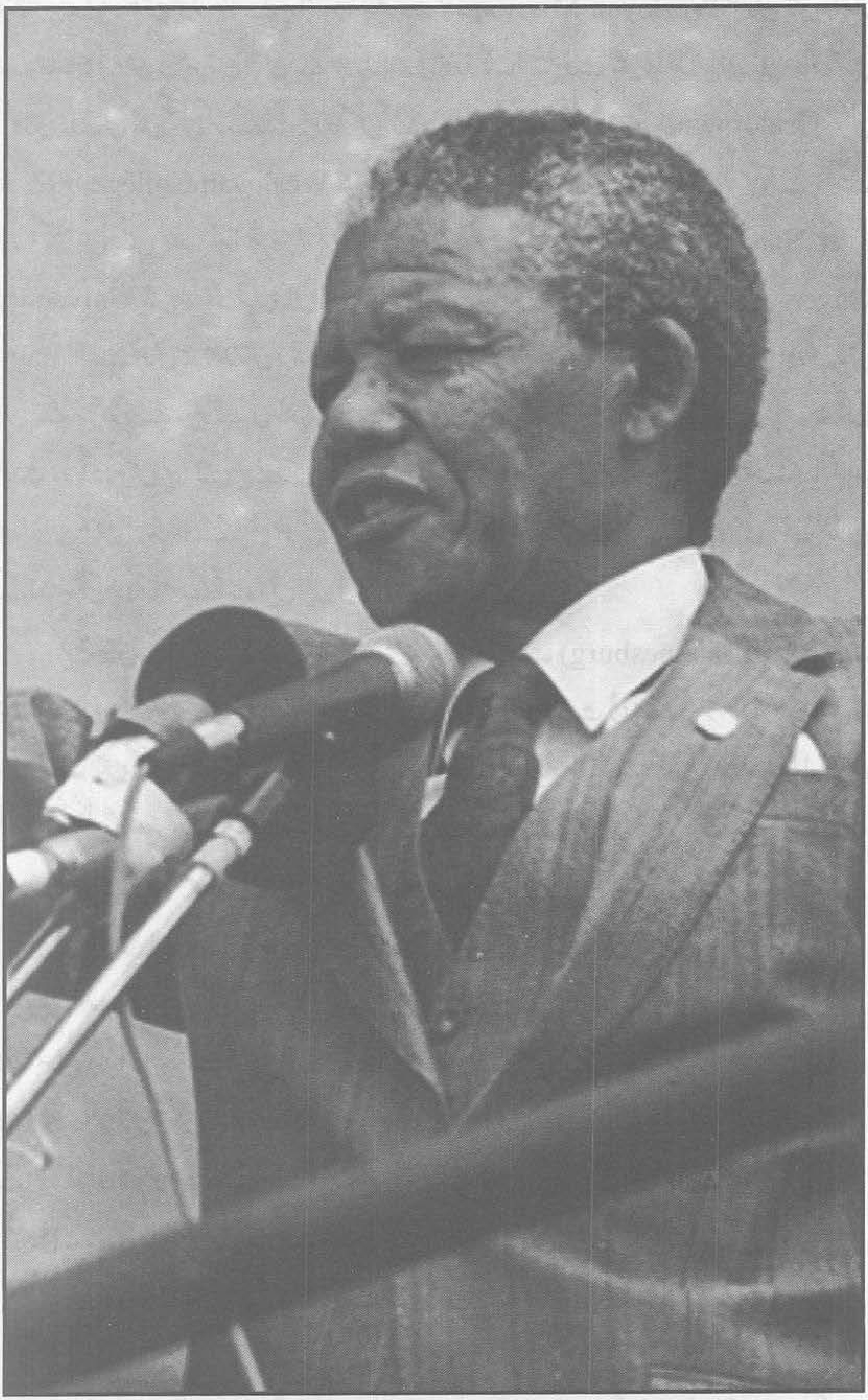
Nelson Mandela

جنوبی افریقہ کی آزادی کے ہیرو اور انقلابی لیڈر

27 برس تک جیل کی سلاخوں کے پیچھے رہنے اور ہر طرح کی صعوبتیں اور ظلم وستم برداشت کرنے کے باوجود جس شخصیت کے عزم واستقلال میں کمی نہ آئی اور جس نے بالآخر اپنے ملک اور قوم کو بدترین سامراج کی قید سے آزاد کروالیا اُس شخصیت کا نام نیلسن منڈیلا ہے جنہیں جنوبی افریقہ کی آزادی کے ہیرو ہونے کے ساتھ ساتھ پہلے سیاہ فام صدر ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہوا اور اُن کی اعلیٰ خدمات پر انہیں امن کا نوبل انعام بھی دیا گیا۔ اس کے علاوہ انہیں دنیا بھر سے 250 ایوارڈ ملے۔

افریقی قوم کے عظیم لیڈر نیلسن مینڈیلا 18 جولائی 1918ء کو یونین آف ساؤتھ افریقہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں Mvezo میں پیدا ہوئے۔ مینڈیلا ان کے دادا کا نام تھا جسے والدین نے اُن کے نام سے بھی منسوب کر دیا۔ نیلسن مینڈیلا کے والد کی چار بیویاں تھیں جن میں ان کے 13 بچے تھے۔ چار لڑکے اور نو لڑکیاں۔ نیلسن مینڈیلا والد کی تیسری بیوی میں سے تھے۔ پیدائش پر ان کا نام Rolihlahla رکھا گیا جس کا مقامی زبان میں معنی مصیبتیں کھڑی کرنے والا یعنی Troublemaker ہے۔

مینڈیلا اپنے خاندان میں سے پہلا بچہ تھا جسے سکول میں داخل کرایا گیا۔ جہاں اُس کی ٹیچر Miss Malingane نے اُس کے نام کے ساتھ نیلسن کا اضافہ کیا اس طرح بعد میں وہ ہمیشہ کے لئے نیلسن مینڈیلا کے نام سے پکارا جانے لگے۔ نیلسن کا مینڈیلا کی عمر ابھی نو برس تھی کہ اُن کے والد کا



انتقال ہو گیا۔ نیلسن مینڈیلا نے پرائمری تعلیم کے بعد Wesleyan Mission سکول میں داخلہ لے لیا۔ 16 برس کی عمر میں نیلسن نے کلارک بری بورڈنگ انسٹیٹیوٹ میں داخلہ لیا اور تین سالہ تعلیمی کورس دو سال میں مکمل کر کے ڈگری حاصل کر لی۔ 1937ء میں نیلسن مینڈیلا Healdtown منتقل ہو گئے اور Wesleyan College میں مزید تعلیم حاصل کی۔ 19 برس کی عمر میں نیلسن نے باکسنگ اور اتھلیٹکس میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ بی اے کرنے کے لئے انہوں نے Fort Hare University میں داخلہ لیا جہاں ان کی ملاقات انقلابی سوچ رکھنے والے طالبعلم Oliver Tambo سے ہوگئی جو بعد میں زندگی بھر نیلسن مینڈیلا کے گہرے دوست رہے اور ہر خوشی اور غمی میں اُن کے ساتھ رہے۔ یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران نیلسن مینڈیلا اسٹوڈنٹس یونین کی سیاست میں ملوث ہو گئے جس پر انہیں یونیورسٹی سے نکال دیا گیا اور دوبارہ کبھی یونیورسٹی میں داخلہ نہ دیا گیا۔ بعدازاں نیلسن مینڈیلا نے اپنی طویل قید کے دوران خط و کتابت کے ذریعے یونیورسٹی آف لنڈن کے ایکسٹرنل پروگرام کے تحت ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔

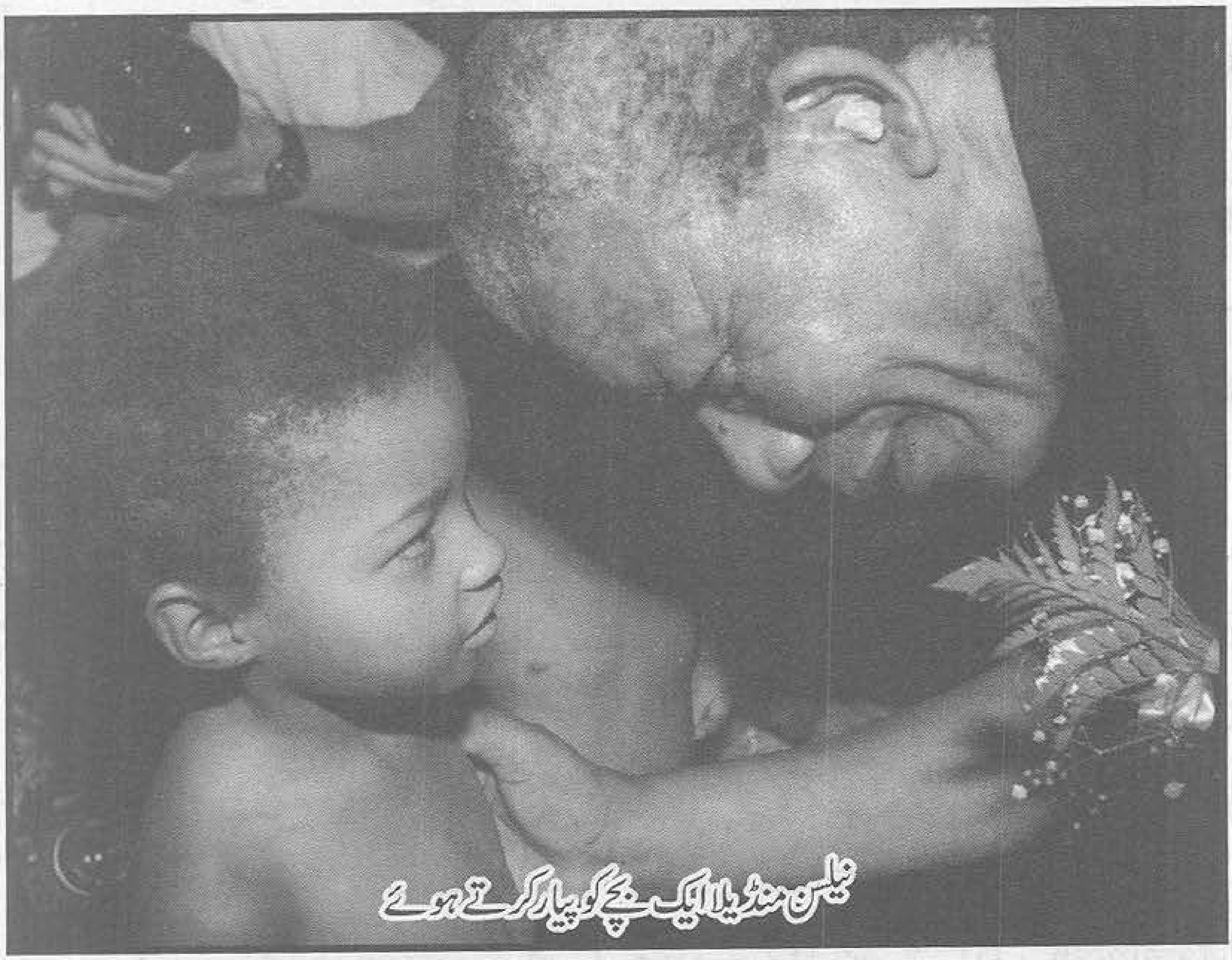
یونیورسٹی سے نکالے جانے پر نیلسن مینڈیلا جہانزبرگ (Johannesburg) چلے گئے۔ جہاں انہوں نے یونیورسٹی آف یوتھ افریقہ سے بذریعہ خط و کتابت بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ جہانزبرگ میں تعلیم کے ساتھ ساتھ انہوں نے مختلف جگہوں پر ملازمت بھی کی اور 1942ء میں افریقن نیشنل کانگرس کے پلیٹ فارم سے سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔

دوسری جنگ عظیم جب اپنے زوروں پر تھی ساؤتھ افریقہ میں نوجوانوں کے ایک چھوٹے سے گروپ نے انقلابی نوجوان Anton Lembede کی قیادت میں ایک پرجوش جدوجہد کا آغاز کیا جس کا مقصد افریقن نیشنل کانگرس کو ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے لاکھوں سیاہ فام طالبعلموں، کسانوں، محنت کشوں اور دانشوروں کی حمایت حاصل کر کے ایک عظیم عوام سیاسی جماعت بنانا تھا اور افریقن نیشنل کانگرس کے موجودہ قائدین کی روایتی اور رواداری پر مبنی سیاست کو تبدیل کر کے جاندار اور بھرپور سیاست کا آغاز کرنا تھا جس سے عوام کے بنیادی حقوق کے حصول اور ان کی آزادی کے لئے راہ ہموار کی جاسکے۔

ستمبر 1944ء میں ان نوجوانوں نے ''افریقن نیشنل کانگرس یوتھ لیگ'' کے قیام کا اعلان کر دیا۔ نیلسن مینڈیلا اپنی بہترین کارکردگی اور خداداد صلاحیتوں کی بناء پر 1947ء میں یوتھ لیگ کے جنرل سیکرٹری چن لئے گئے۔ یوتھ لیگ کے ارکان کی اعلیٰ خدمات کے اعتراف میں اس کے دو



نیلسن منڈیلا ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے



نیلسن منڈیلا ایک بچے کو پیار کرتے ہوئے

لیڈروں Anton Lembede اور Ashby Mda کو افریقن نیشنل کانگرس کی نیشنل ایگزیکٹو کمیٹی کا رکن بنا لیا گیا اور دو سال بعد یوتھ لیگ کے ایک اور لیڈر Oliver Tambo بھی نیشنل ایگزیکٹو کمیٹی میں شامل کر لئے گئے۔

1948ء میں جنوبی افریقہ میں منعقد ہونے والے عام انتخابات میں نسل پرستی کے باعث صرف سفید فام افراد کو الیکشن لڑنے کی اجازت دینے پر اکثریتی سیاہ فام عوام میں شدید غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ ردعمل کے طور پر 1949ء میں یوتھ لیگ کے اصرار پر افریقن نیشنل کانگرس نے پروگرام آف ایکشن (Programme of Action) کا اعلان کیا جس میں سفید فام نسل پرست حکومت کے خلاف ہڑتالوں، بائیکاٹ، عدم اعتماد، عدم تعاون اور سول نافرمانی کو افریقن نیشنل کانگرس کی آفیشل پالیسی (Official Policy) قرار دے دیا گیا۔ پروگرام آف ایکشن کو یوتھ لیگ کی ایک چھ رکنی کمیٹی نے ترتیب دیا جس میں نیلسن مینڈیلا کے علاوہ David Bopape، Ashby Mda، James Njongue، Walter Sisulu اور Oliver Tambo شامل تھے۔

1950ء میں نیلسن مینڈیلا کو بھی افریقن نیشنل کانگرس کی نیشنل ایگزیکٹو کمیٹی کا رکن بنا لیا گیا۔ پروگرام آف ایکشن کے تحت نیلسن مینڈیلا نے دیگر ساتھیوں کے ساتھ مل کر جو ایجنڈا پیش کیا اُس میں جنوبی افریقہ کے تمام عوام کے لئے مکمل شہریت، پارلیمنٹ میں تمام عوام کو نمائندگی کا حق، زمینوں کی ازسرِنو تقسیم، ٹریڈ یونین کا حق اور تعلیم و ثقافت میں برابری کا حق حاصل کرنا ضروری قرار دیا گیا۔

1952ء میں افریقن نیشنل کانگرس نے ناانصافی پر مبنی قوانین کو تسلیم نہ کرنے کی مہم چلانے کا اعلان کیا اور نیلسن مینڈیلا کو اس مہم کا Volunteer-in-Chief مقرر کر دیا۔ نیلسن مینڈیلا نے ملک کے طول و عرض کے دورے کئے اور عوام کو متحرک کرنے کی بھرپور کوشش کی اس پاداش میں نیلسن مینڈیلا کو نسل پرست انتظامیہ نے گرفتار کر لیا اور ان پر مقدمہ چلایا۔ قید کی سزا بھی سنائی گئی مگر بعد میں اس پر عمل درآمد روک دیا تاہم نیلسن مینڈیلا پر پابندی عائد کر دی کہ وہ کسی جلسہ جلوس یا میٹنگ میں شرکت نہیں کر سکتے اور چھ ماہ تک جوہانسبرگ سے باہر نہیں جا سکتے۔ اس پابندی کے دوران نیلسن نے اپنے دوست Oliver Tambo کے ساتھ مل کر جوہانسبرگ میں ایک دفتر کھول لیا اور قانونی مشاورت کا کام شروع کر دیا۔ اسی دوران انہیں افریقن نیشنل کانگرس کی یوتھ لیگ کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ 1952ء سے 1960ء تک کے عرصہ میں نیلسن مینڈیلا نے عوام کے لئے حقوق کی بازیابی کے لئے دن رات جدوجہد کی اور اس کے نتیجہ میں متعدد بار گرفتار ہوئے۔ انہیں Mammoth

Treason Trial میں مرکزی ملزم قرار دیا گیا اور 1960ء میں Sharpville Massacre کے بعد نیلسن مینڈیلا کو گرفتار کر لیا گیا جبکہ افریقن نیشنل کانگرس کو غیر قانونی قرار دے کر اس پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی۔ اب نیشنل کانگرس کے کارکنوں نے زیر زمین سرگرمیاں شروع کر دیں۔ نیلسن مینڈیلا نے اس دوران انتہائی اہم کردار ادا کیا اور ایک بڑے لیڈر کے طور پر ابھر کر سامنے آئے۔ نیلسن مینڈیلا بھیس بدل کر سیاسی سرگرمیاں سرانجام دینے لگے۔ انہوں نے اپنے دیگر ساتھیوں سے مل کر ایک خصوصی تحریک آزادی Liberation Movement کی بنیاد رکھی جس میں اپنے حقوق کے حصول کے لئے ضرورت پڑنے پر مسلح جدوجہد (Armed Struggle) کرنے کا دروازہ بھی کھول دیا گیا۔ نیلسن مینڈیلا غیر قانونی طریقے سے ملک سے باہر چلے گئے۔ اس دوران انہیں ایتھوپیا Ethiopia میں ایسٹ اینڈ سنٹرل افریقہ کی پین افریقن فریڈم موومنٹ Pan African Freedom Movement سے خطاب کا موقع ملا۔ یہاں انہیں مختلف ممالک سے آئے ہوئے سیاسی قائدین نے اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ اس دورہ کے دوران نیلسن مینڈیلا نے اپنی لبریشن موومنٹ کے ممبران کے لئے گوریلا ٹریننگ کے لئے ضروری اقدامات کئے۔ اپنے ملک واپس آنے کے چند روز بعد نسل پرست حکومت نے نیلسن مینڈیلا کو گرفتار کر لیا اور اُن پر عوام کو ہڑتالوں پر اکسانے اور ملک سے غیر قانونی طور پر جانے کے الزامات کے تحت مقدمات قائم کر دیئے۔

مقدمہ چلا تو نیلسن مینڈیلا نے اپنے اوپر لگائے ہوئے الزامات کو تسلیم کر لیا اور کہا ”میں نسل پرستی سے نفرت کرتا ہوں کیونکہ میں اس کو ایک وحشیانہ عمل سمجھتا ہوں۔ چاہے اس کو گورا کرے یا کالا“۔

نیلسن مینڈیلا کو اس مقدمہ میں پانچ سال قید کی سزا سنائی گئی۔ نیلسن مینڈیلا ابھی یہ سزا کاٹ رہے تھے کہ انہیں بغاوت کے ایک مقدمہ میں پھنسا دیا گیا جسے Rivonia Trial کا نام دیا گیا۔ نیلسن مینڈیلا کی طرف سے ان مقدمات کے دوران جو بیانات دیئے گئے ان کی مثال دنیا کی سیاسی تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔ Revonia Trial کے دوران انہوں نے اپنے بیان میں کہا۔ ”میں نے گوروں کی اجارہ داری اور کالوں کی اجارہ داری کے خلاف لڑائی لڑی ہے۔ میں نے ایک بہترین جمہوری اور آزاد معاشرے کا خواب دیکھا ہے جہاں تمام لوگ یگانگت اور یکساں مواقع کی فراہمی کے ساتھ رہ سکیں۔ اس خواب کو پورا کرنے کے لئے میں زندہ ہوں اور اس خواب کی تکمیل کے لئے اگر مجھے مرنا بھی پڑے تو مجھے قبول ہے“۔

اس مقدمہ میں نیلسن مینڈیلا کو عمر قید کی سزا سنا دی گئی اور انہیں جنوبی افریقہ کی بدنام زمانہ جیل Robben Island Prison میں منتقل کر دیا گیا جو کہ Cape Town سے سات میل دور ایک چھوٹے سے جزیرے میں تعمیر کی گئی تھی۔ 22 برس بعد اپریل 1948ء کو انہیں Cape Town کی Pollsmoor Prison میں ٹرانسفر کر دیا گیا اور دسمبر 1988ء میں نیلسن مینڈیلا کو Paar کے قریب Victor Vestor Prison میں منتقل کر دیا گیا۔ جیل میں اسیری کے دوران انہیں رہائی کے لئے متعدد بار پیشکش کی گئی مگر انہوں نے اپنے مؤقف اور اصولوں پر سمجھوتہ کرنے کی بجائے پابند سلاسل رہنا پسند کیا۔ بالآخر 11 فروری 1990ء کو نیلسن مینڈیلا اپنے مقصد میں کامیابی پر جیل سے رہا کر دیئے گئے۔ رہائی کے فوراً بعد پوری دل جمعی سے نیلسن مینڈیلا اسی جدوجہد میں لگ گئے جو چالیس برس قبل انہوں نے شروع کی تھی۔

افریقن نیشنل کانفرنس کی بحالی کے بعد 1991ء میں منعقد ہونے والی اس کی پہلی کانفرنس میں نیلسن مینڈیلا کو افریقن نیشنل کانگرس کا صدر منتخب کر لیا گیا اور ان کے دیرینہ دوست Oliver Tambo آرگنائزیشن کے نیشنل چیئر پرسن چن لئے گئے۔ رہائی کے فوراً بعد نیلسن مینڈیلا نے اپنے تمام کارکنوں کو مسلح جدوجہد ترک کرنے کا حکم دے دیا اور اعلان کیا کہ ان کی جدوجہد کا مقصد سیاہ فام اکثریت کو ظلم وستم سے بچا کر امن سے ہمکنار کرنا اور انہیں بلدیاتی اور قومی انتخابات میں ووٹ کا حق دلوانا تھا اور دونوں مقاصد حاصل ہو چکے ہیں۔

27 اپریل 1994ء کو جنوبی افریقہ میں مساوی حق رائے دہی کی بنیاد پر پہلے ملک گیر انتخابات ہوئے جس میں افریقن نیشنل کانفرنس کو 62 فیصد ووٹوں سے کامیابی مل گئی۔ یکم مئی 1994ء کو نیلسن مینڈیلا ساؤتھ افریقہ کے پہلے سیاہ فام صدر منتخب ہو گئے۔ انہوں نے سفید فام سابق صدر ڈی کلارک کو نائب صدر اور Thabo Mbeki (تھابو موبیکی) کو گورنمنٹ آف نیشنل یونٹی میں دوسرا بڑا عہدہ دے دیا۔

نیلسن مینڈیلا مئی 1994ء سے جون 1999ء تک اپنے ملک کے صدر رہے اور انہوں نے دیگر اہم اصلاحات کے علاوہ ملک میں مفاہمت کی سیاست کو فروغ دینے کی بھرپور کوشش کی انہوں نے ماضی کی تلخیوں کو فراموش کر کے ایک روشن اور خوشحال مستقبل کے لئے قوم کو تیار کیا۔

نیلسن مینڈیلا نے جب صدارت کا عہدہ سنبھالا تو ان کی عمر 75 برس تھی لہٰذا اپنی پہلی صدارتی مدت مکمل ہونے پر انہوں نے 1999ء میں اگلی مدت کے لئے الیکشن نہ لڑنے کا فیصلہ کیا۔ جون

2004ء میں وہ سیاست سے ریٹائر ہو گئے تاہم سماجی اور رفاعی کاموں میں وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔

نیلسن مینڈیلا کو نوبل امن انعام کے علاوہ بھی انسانی حقوق کے لئے اُن کی خدمات کے باعث متعدد انعامات ملے۔ دنیا کی پچاس سے زائد یونیورسٹیوں نے انہیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری بھی عطا کیں۔

نیلسن منڈیلا کی نجی زندگی سے متعلق بھی بعض چیزیں قابل ذکر ہیں۔ نیلسن مینڈیلا نے اپنی زندگی میں تین شادیاں کیں جن میں سے اُن کے چھ بچے پیدا ہوئے۔ نیلسن مینڈیلا کی پہلی شادی Evelyn Ntoko Mase سے 1944ء میں ہوئی اور 13 برس قائم رہنے کے بعد 1957ء کو طلاق پر ختم ہوئی۔ وجہ نیلسن مینڈیلا کی ضرورت سے زیادہ سیاسی مصروفیات اور مالی مشکلات تھیں۔ اس بیوی سے دو بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ایک بیٹا Thembi 1969ء میں 25 سال کی عمر میں کار کے ایک حادثہ میں ہلاک ہو گیا۔ جبکہ دوسرا بیٹا Makgatho 2005ء میں ایڈز کے مرض میں مبتلا ہو کر 55 برس کی عمر میں فوت ہو گیا۔ پہلی بیٹی Maki صرف 9 ماہ کی عمر میں فوت ہو گئی اور دوسری بیٹی جس کا نام بھی انہوں نے Maki ہی رکھا وہ ابھی تک حیات ہیں۔

نیلسن مینڈیلا کی دوسری شادی 1957ء میں ہی Winnie Madikizela سے ہوئی جو جہانزبرگ شہر کی پہلی سیاہ فام سوشل ورکر تھیں۔ ان سے ان کی دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ پہلی بیٹی Zeni فروری 1958ء اور دوسری بیٹی Zindzi 1960ء میں پیدا ہوئی۔ نیلسن مینڈیلا اور ونی کے درمیان سیاسی وجوہات کی بناپر اپریل 1992ء میں علیحدگی ہو گئی اور مارچ 1996ء میں باقاعدہ طلاق ہو گئی۔

نیلسن مینڈیلا نے تیسری شادی اپنی 80 ویں سالگرہ کے موقع پر 1998ء میں Graca Machel نامی خاتون سے کی جو موزمبیق کے سابق صدر Samora Machel جو 12 سال قبل ایک فضائی حادثہ میں جاں بحق ہو گئے تھے، کی بیوہ ہیں۔

نیلسن مینڈیلا کی ایک اور اہم بات ایڈز (Aids) کے خاتمہ کے لئے اُن کی جدوجہد ہے۔ نیلسن مینڈیلا کے اپنے بیٹے Makgatho بھی ایڈز کے باعث وفات پا گئے تھے۔ اپنی سیاسی زندگی سے ریٹائرمنٹ کے بعد نیلسن مینڈیلا نے ایڈز کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ 2000ء میں انہوں نے ڈربن کے مقام پر منعقدہ آٹھویں انٹرنیشنل ایڈز کانفرنس میں خصوصی لیکچر دیا۔ 2002ء

میں انہوں نے 46664 ایڈز فنڈنگ مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جولائی 2004ء میں وہ پندرہویں انٹرنیشنل ایڈز کانفرنس میں شرکت کے لئے تھائی لینڈ کے شہر بنکاک گئے۔

18 جولائی 2007ء کو نیلسن مینڈیلا نے جنوبی افریقہ کے دارالحکومت جہانزبرگ میں دنیا کے اہم بزرگ راہنماؤں کا اجلاس بلایا تا کہ دنیا کو درپیش اہم مسائل پر ان سے راہنمائی لی جا سکے۔ نیلسن مینڈیلا نے اس موقع پر ایلڈرز (Elders) کے نام سے ایک گروپ کے قیام کا اعلان کیا۔ آرچ بشپ ٹوٹو (Archbishop Tutu) کو ایلڈرز کی صدارت سونپی گئی۔ ایلڈرز کے بنیادی ممبران میں Graca Machel، Kofi Anan، Ela Bhatt، Gro Harlem Brund Land، Jimmy Carter، Li Zhaoxing، Mary Robinson اور Mohammad Yunus شامل ہیں۔ نومبر 2009ء میں اقوام متحدہ کی جنرل ایمبلی نے اعلان کیا کہ نیلسن مینڈیلا کے جنم دن 18 جولائی کو پوری دنیا میں مینڈیلا ڈے کے طور پر منایا جائے گا۔

جنوبی افریقہ کی حکومت نے نیلسن مینڈیلا کی 90ویں سالگرہ 18 جولائی 2008ء کو سارے ملک میں دھوم دھام سے منائی۔

فروری 1911ء میں منڈیلا بیمار ہو گئے اور انہیں ہسپتال داخل کروا دیا گیا۔ 22 جون 2013ء کو شدید بیماری اور کمزوری کے باعث نیلسن منڈیلا کی آنکھیں کھلنا بند ہو گئیں اور وہ کسی کو پہچاننے کے قابل نہ رہے۔ منڈیلا اگرچہ دسمبر 2013ء تک زندہ رہے مگر عملی طور پر وہ بستر مرگ پر ہی تھے۔

5 دسمبر 2013ء کو نیلسن منڈیلا اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ وفات کے وقت ان کی عمر 95 برس تھی جنوبی افریقہ کی حکومت نے اپنے عظیم لیڈر کی موت کا سوگ سرکاری طور رپ 10 روز تک منایا۔ 15 دسمبر 2013ء کو باضابطہ طور پر نیلسن منڈیلا کی تدفین کر دی گئی۔ تقریباً 90 ممالک نے اپنی اہم شخصیات کو اُن کی آخری رسومات میں شرکت کے لئے جنوبی افریقہ بھیجا جن میں سے زیادہ تر سربراہان مملکت تھے۔

ماؤزے تنگ

Mao-Tse-Tung

پیپلز ریپبلک آف چائنہ کے بانی و انقلابی لیڈر

ایک معمولی کسان کے بیٹے ماؤزے تنگ نہ صرف عوامی جمہوریہ چین کے سب سے بڑے اور طاقتور لیڈر ثابت ہوئے بلکہ دنیا کے عظیم ترین قائدین میں وہ ایک سرکردہ حیثیت کے حامل قرار پائے۔ ماؤزے تنگ نے آبادی کے اعتبار سے دنیا کے سب سے بڑے ملک چین کو اپنی انقلابی سوچ اور قابل رشک عملی اقدامات کے ذریعے ایک جدید ترین ملک بنانے کے علاوہ صنعتی، فوجی اور اقتصادی لحاظ سے دنیا کی ایک ناقابل شکست طاقت بنا دیا۔ آج کے تاریخ دان چین کو ماؤزے تنگ اور ماؤزے تنگ کو چین کہنے میں حق بجانب ہیں۔

سرزمین چین کے عظیم سپوت ماؤزے تنگ 26 دسمبر 1893ء کو چین کے صوبہ ہونان (Hunan) کے ایک گاؤں شاؤشان (Shaoshan) میں پیدا ہوئے۔ 8 سال کی عمر میں وہ اپنے گاؤں کے ایک پرائمری سکول میں داخل ہوئے مگر 13 سال کی عمر میں سکول چھوڑ دیا اور ایک زرعی فارم میں کام کرنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد تعلیم شروع کی اور ہونان صوبہ کے دارالحکومت شانگ شا (Shangha) کے ایک سیکنڈری سکول میں داخلہ لے لیا۔ 1911ء میں جب بادشاہت کے خلاف انقلاب کا آغاز ہوا تو وہ اپنے صوبہ کی انقلابی فوج میں شامل ہو گئے۔ 1912ء میں بادشاہت ختم ہو گئی اور ریپبلک آف چائنہ کا قیام عمل میں آیا تو ماؤزے تنگ نے فوج سے علیحدگی اختیار کر لی اور ایک بار پھر تعلیم کا حصول شروع کر دیا۔ 1918ء میں انہوں نے گریجوایشن کا امتحان پاس کر لیا۔ ماؤزے تنگ نے مزید تعلیم اپنے کالج کے ایک پروفیسر یانگ چنگ جی (Yang Changji) جو

1919ء میں پیکنگ یونیورسٹی (Paking University) سے وابستہ ہو گئے، سے حاصل کی۔ پروفیسر یانگ کی سفارش پر ہی ماؤزے تنگ کو یونیورسٹی میں بطور اسسٹنٹ لائبریرین ملازمت مل گئی۔ 1920ء میں پروفیسر یانگ کا انتقال ہو گیا مگر پروفیسر یانگ کی تعلیمات اور تربیت نے ماؤزے تنگ کے دل و دماغ پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ کچھ عرصہ بعد ماؤزے تنگ نے پروفیسر یانگ کی بیٹی Yang Kaihui سے شادی کر لی۔ اکتوبر 1930ء میں چین کی نیشنلسٹ پارٹی کومن تانگ (Kuomintang) نے ماؤزے تنگ کی بیوی اور بیٹے کو گرفتار کر لیا اور دونوں کو جیل میں ڈال دیا۔ بعدازاں ماؤزے تنگ کے بیٹے Anying کو رہا کر دیا مگر بیوی کو قتل کر دیا۔

23 جولائی 1921ء کو 27 برس کی عمر میں ماؤزے تنگ نے شنگھائی شہر میں منعقد ہونے والے کمیونسٹ پارٹی آف چائنہ کی نیشنل کانگرس کے پہلے اجلاس میں شرکت کی۔ دو سال کے بعد ماؤزے تنگ کو کمیونسٹ پارٹی کی سینٹرل کمیٹی کا رکن بنا دیا گیا۔ اس سال کے آخر میں ماؤ واپس اپنے آبائی صوبہ ہونان آ گئے اور وہاں کمیونسٹ پارٹی کی ہدایت پر ''کومن تانگ'' کی تنظیم قائم کی۔ 1924ء میں ماؤ کومن تنگ کی شنگھائی برانچ کے ایگزیکٹو رکن اور آرگنائزنگ ڈیپارٹمنٹ کے سیکرٹری بنا دیئے گئے۔ ماؤزے تنگ کچھ عرصہ شنگھائی میں قیام پذیر رہے اور پارٹی کی مختلف شعبوں میں تنظیم سازی پر ترجہ دی۔

اکتوبر 1925ء میں ماؤزے تنگ کومن تانگ کے پراپیگنڈہ ڈائریکٹر بنا دیئے گئے۔ 1927ء میں ماؤزے تنگ نے محنت کشوں اور کسانوں پر مشتمل انقلابی فوج کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے چنگ شاہ (Changsha) میں Autum Harvest uprising کی قیادت کی۔ بعدازاں انہوں نے انقلابی فوج میں مزید کسانوں اور محنت کشوں کو شامل کیا اور اسے مزدوروں اور کسانوں کی ''سرخ فوج'' (Red Army) کا نام دیا۔ ادھر کومن تانگ کو ماؤزے تنگ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور انقلابی سرگرمیوں پر تشویش ہونے لگی اور اس کے لیڈر ماؤ کو اپنے لئے خطرہ سمجھنے لگے۔

12 مارچ 1925ء کو کومن تانگ کے قائد سن یات سن Sun-Yat-Sen کا انتقال ہو گیا تو چیانگ کائی شیک (Chiang-Tai-Shek) کومن تانگ کے سربراہ بن گئے اور انہوں نے فوری اقدامات کے ذریعے اپنی پارٹی سے کمیونسٹوں کا صفایا کرنا شروع کر دیا۔ جو کمیونسٹ چیانگ کائی شیک کے عتاب سے بچنے میں کامیاب ہو گئے انہوں نے ماؤزے تنگ کی قیادت میں Jiangxi Soviet کے نام سے الگ گروپ بنا لیا۔ چیانگ کائی شیک نے جب کمیونسٹوں کا جینا دوبھر کر دیا تو



ماؤزے تنگ نے کومن تانگ کے زیر اثر علاقہ کو چھوڑ کر چین کے شمال مغربی علاقہ میں چلے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

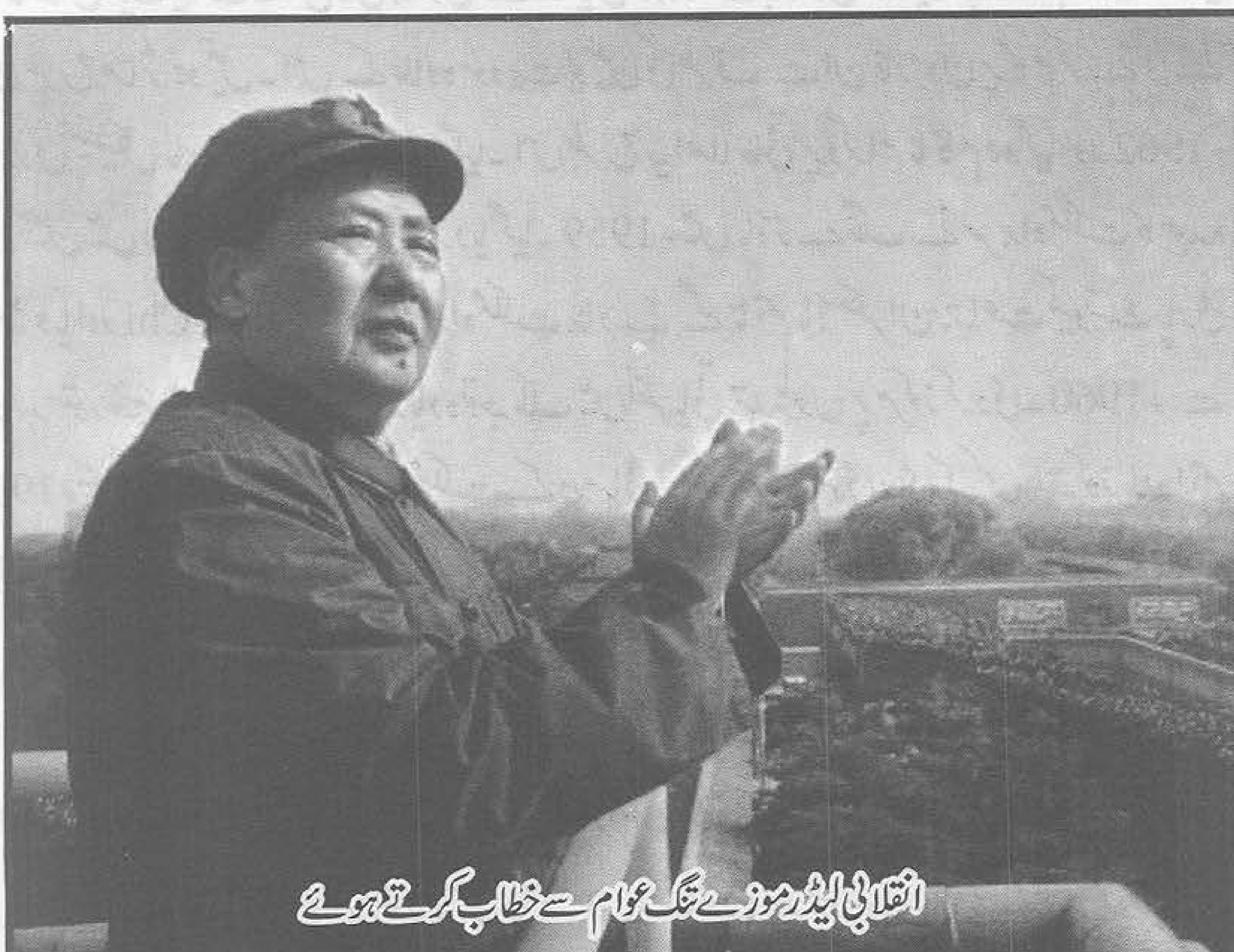
اکتوبر 1934ء میں ماؤزے تنگ، لن بیاؤ (LinBiao) اور زودی Zhu De کی قیادت میں تقریباً ایک لاکھ افراد نے ملک کے مغربی علاقہ کی طرف مارچ شروع کیا۔ راستہ انتہائی دشوار گزار تھا اور کارواں کو سنگلاخ پہاڑوں پر سفر کرنا تھا۔ کارواں نے 50 میل روزانہ کے حساب سے سفر کرتے ہوئے آٹھ ہزار میل کا سفر طے کیا اور 20 اکتوبر 1935ء کو منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ تاہم اس طویل اور مشکل سفر میں ایک لاکھ میں سے ستر ہزار افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور صرف تیس ہزار افراد زندہ بچ سکے۔ یہاں یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ ماؤزے تنگ نے 1931ء سے لے کر 1934ء تک سوویت ریپبلک آف چائنہ (Soviet Republic of China) کے نام سے Jiangxi کے پہاڑی علاقہ میں اپنی حکومت قائم کی جو زیادہ دیر نہ چل سکی۔ اسی دوران انہوں نے ''ہی زرہن'' (HeZizhen) نامی خاتون سے شادی کر لی۔

1937ء میں جاپان نے چین پر حملہ کر دیا اور چین کے بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ماؤزے تنگ جو اس وقت اپنی سرخ فوج کو بہت منظّم کر چکے تھے نے جاپانی فوجوں کا بھرپور مقابلہ کیا اور گوریلہ کارروائیوں کے ذریعے جاپانیوں کو زبردست جانی و مالی نقصان پہنچایا۔ ماؤزے تنگ کے مخالفین جن میں کومن تانگ کے لیڈر چیانگ کائی شیک اور امریکہ کے حکمران شامل تھے نے ماؤزے تنگ کے طریقہ جنگ کی زبردست مخالفت کی کیونکہ امریکہ چیانگ کائی شیک کو اپنا حامی اور ماؤزے تنگ کو کمیونسٹ ہونے اور سوویت یونین کے حامی ہونے کے باعث اپنا دشمن تصور کرتا تھا۔ جاپان کے ساتھ جنگ کرنے کے ساتھ ساتھ ماؤزے تنگ نے کمیونسٹ پارٹی پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور 1942ء میں ماؤزے تنگ پولٹ بیورو آف دی کمیونسٹ پارٹی آف چائنہ (Poletbureau of the Communist Party) کی اسٹیڈنگ کمیٹی کے اہم رکن بن گئے۔ انہی دنوں انہوں نے اپنی بیوی He Zizhen کو طلاق دے دی اور ایک ایکٹرس Lan Ping سے شادی کر لی جو بعد میں Jiang Qing کے نام سے مشہور ہوئیں۔

جاپان کے ساتھ جنگ اور کمیونسٹ پارٹی پر گرفت کے ساتھ ساتھ ماؤزے تنگ نے چین کے اُن علاقوں پر بھی قبضہ کرنے پر بھرپور توجہ دی جو چیانگ کائی شیک کی حکمرانی میں تھے۔ ماؤزے تنگ کی گوریلا فوج ''ذودی'' (Zhu De) اور لن بیاؤ (Lin Biao) کی قیادت روز بروز مزید



نوجوان موزے تنگ اپنے انقلابی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے



انقلابی لیڈر موزے تنگ عوام سے خطاب کرتے ہوئے

مضبوط اور وسیع ہوگئی ادھر دوسری جنگ عظیم میں اتحادی فوجوں کے ہاتھوں شکست کے بعد جاپانی فوجوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اب ماؤزے تنگ کی گوریلہ فوج نے چیانگ کائی شیک کی فوج کے خلاف بھرپور جنگ کا آغاز کردیا۔ آہستہ آہستہ سرخ فوج نے چین کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کرلیا اور یکم اکتوبر 1949ء کو ماؤزے تنگ نے باضابطہ طور پر اپنی قیادت میں پیپلز ریپبلک آف چائنہ (Peoples Republic of China) کے قیام کا اعلان کردیا۔ چیانگ کائی شیک اپنی جان بچا کر تائیوان چلے گئے جہاں انہوں نے اپنی الگ حکومت قائم کرلی۔ امریکہ نے ہمیشہ چیانگ کائی شیک کی حمایت جاری رکھی۔ ماؤزے تنگ عوامی جمہوریہ چین کے قیام کے اعلان سے لے کر اپنی زندگی کی آخری سانس تک چین کے سیاہ وسفید کے مالک رہے۔

1958ء میں Great Leap Forward کے عنوان سے انہوں نے ایک اصلاحاتی پروگرام جاری کیا جس کا مقصد زرعی اور صنعتی پیداوار بڑھانا تھا۔ اس پروگرام کے تحت 75000 افراد پر مشتمل کمیون (Communes) بنائے گئے اور انہیں موقع دیا گیا کہ وہ اپنے زرعی فارم اور فیکٹریوں کا انتظام خود چلائیں۔ ہر خاندان کو آمدنی کا ایک خاص حصہ دیا جاتا تھا اور رہائش کے لئے فی خاندان ایک پلاٹ۔ لیکن تین برسوں کے درمیان زبردست بارشوں اور سیلاب کے باعث فصلیں بری طرح متاثر ہوئیں۔ اس کے علاوہ سوویت یونین کی طرف سے ان فارموں پر کام کرنے والے ہزاروں ٹیکنیکل ماہرین کو واپس بلا لیا گیا۔ اس طرح یہ اصلاحاتی پروگرام ناکام ہوگیا اور 1962ء میں چین میں دوبارہ پرانا نظام رائج کردیا گیا۔ 1959ء میں ماؤزے تنگ نے سربراہ مملکت کا عہدہ چھوڑ دیا اور Liu-Shao-Chi سربراہ مملکت بنا دیئے گئے تاہم ماؤ حکمران جماعت کمیونسٹ پارٹی کے بدستور چیئرمین رہے اور اپنی زیادہ توجہ ملک میں نظریاتی تبدیلیوں پر مرکوز کردی۔ 1960ء سے 1965ء تک چیئرمین ماؤ اور سربراہ مملکت کے درمیان یہ جدوجہد جاری رہی کہ کس طبقہ کو زیادہ اہم سمجھا جائے صنعتی مزدوروں کو یا کسانوں کو۔ چیئرمین ماؤ کی نظر میں کسانوں کی زیادہ اہمت تھی جبکہ سربراہ مملکت صنعتی مزدوروں کو زیادہ سپورٹ کرتے تھے۔

1966ء میں چیئرمین ماؤزے تنگ نے ''ثقافتی انقلاب'' (Cultural Revolution) کا اعلان کردیا چیئرمین ماؤزے تنگ کے دست راست Lin Biao نے 3 ستمبر 1966ء کو ایک نشری تقریر کے ذریعے عوام اور بطور خاص طالبعلموں، کسانوں اور کمیونسٹ پارٹی کے عہدیداروں پر زور دیا کہ وہ پارٹی کے اندر ایسے افراد کی مذمت کریں جو روس کے صدر خروشیف کے خیالات سے

زیادہ متاثر ہیں۔ ماؤزے تنگ ایسے لوگوں سے نالاں تھے جو روس کے راہنماؤں سے متاثر ہو کر چیئر مین ماؤ کی پالیسیوں پر تنقید کرتے تھے۔ اُن میں سب سے نمایاں Liu Shaoqi تھے۔ چیئر مین ماؤ نے اپنے مضامین میں جو اُن کے مشہور کتاب Red Book میں شائع ہوئے اور جو تمام تعلیمی اداروں میں لازمی طور پر پڑھائے جاتے تھے میں طالبعلموں اور نوجوانوں کو متنبہ کیا کہ عوامی جمہوریہ چین کے انقلاب کو بیرون ممالک سے نقصان پہنچانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ انہوں نے عوام پر زور دیا کہ وہ چین میں ایک مراعات یافتہ طبقہ کو پیدا ہونے سے روکیں ورنہ چین میں بھی وہی صورت حال پیدا ہو جائے گی جو سوویت یونین میں سٹالن اور خروشیف کے دور اقتدار میں پیدا ہو گئی تھی۔

ثقافتی انقلاب اُس وقت اختتام پذیر ہوا جب 13 اکتوبر 1968ء کو Liu Shaoqi نے تمام عہدوں سے استعفیٰ دے دیا۔ Luishaoqi اس وقت چین کے سربراہ مملکت تھے اور ڈنگ ژیاؤپنگ (Deng Xiaoping) جو جنرل سیکٹری تھے ان کے حامیوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان دونوں راہنماؤں کا موقف تھا کہ ماؤزے تنگ کو اقتدار سے مکمل طور پر الگ ہو جانا چاہئے تاہم وہ رسمی طور پر ملک کے سربراہ رہیں اور عام تاثر یہ ہے کہ ماؤزے تنگ نے اُن دونوں پارٹی راہنماؤں کے اثر کو زائل کرنے کے لئے ثقافتی انقلاب کا آغاز کیا لیکن یہ بات کبھی ثابت نہ ہو سکی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس ثقافتی انقلاب نے چین کے رواتی ثقافتی ورثہ کو بہت نقصان پہنچایا اور لاتعداد افراد کو جیلوں میں بند کیا گیا جس سے اقتصادی اور سماجی ابتری کا ماحول پیدا ہو گیا۔ ریڈ گارڈز (Red Guards) کو اجازت تھی کہ وہ جس شخص کو چاہیں گرفتار کریں اور جس قسم کی چاہیں سزائیں دیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ثقافتی انقلاب کے دوران اگست اور ستمبر 1966ء کے مہینوں میں صرف دارالحکومت بیجنگ میں 1772ء افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ 1969ء میں چیئر مین ماؤزے تنگ نے باضابطہ طور پر اعلان کر دیا کہ ثقافتی انقلاب مکمل ہو گیا ہے تاہم بعض حلقوں کا خیال ہے کہ ثقافتی انقلاب 1976ء میں ماؤزے تنگ کی وفات تک جاری رہا۔ ثقافتی انقلاب کے دوران لن بیاؤ Lin Biao ماؤزے تنگ کے بہت قریب ہو گئے اور انہیں چیئر مین ماؤ کا جانشین سمجھا جانے لگا اور کچھ عرصہ بعد انہیں سرکاری طور پر چیئر مین ماؤ کا جانشین قرار دے دیا گیا۔

1971ء میں چیئر مین ماؤزے تنگ کو لن بیاؤ کی بعض حرکتوں کے باعث اُن سے بدظن ہو گئے ماؤزے تنگ کو بتایا گیا کہ لن بیاؤ ان کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ بعدازاں سرکاری اداروں

نے ثبوت فراہم کر دیئے کہ لن بیاؤ سوویت یونین کی خفیہ ایجنسی KGB کے ذریعے ماؤزے تنگ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ ماؤزے تنگ کا لن بیاؤ سے اعتماد اٹھ گیا اور انہوں نے لن بیاؤ کو کمیونسٹ پارٹی سے نکال دیا۔ بعد میں لن بیاؤ ایک فضائی حادثہ میں ہلاک ہو گئے۔ ان کی ہلاکت پر یہ بھی کہا گیا کہ وہ گرفتار ہو جانے کے خدشہ کے باعث ملک سے فرار ہو رہے تھے کہ موت نے انہیں آن لیا۔ زندگی کے آخری برسوں میں چیئرمین ماؤ کی صحت Parkinson کی بیماری کے باعث گرنے لگی۔ لن بیاؤ کی بیوفائی کے صدمے نے بھی ان کی صحت پر نہایت برے اثرات مرتب کئے۔ 2 ستمبر 1976ء کو چیئرمین ماؤ کو دل کا دورہ پڑا۔ ایکس ریز سے معلوم ہوا کہ ان کے گردے بری طرح متاثر ہو چکے ہیں۔

5 ستمبر 1976ء کو سرکاری طور پر اعلان کیا گیا کہ چیئرمین ماؤ کی حالت بدستور خطرناک ہے۔ وزیراعظم ہوا کوفنگ نے اُن کی بیوی Jiang Qing کو بلا لیا کیونکہ چیئرمین ماؤ کے بارے میں کوئی بری خبر کسی وقت بھی بن سکتی تھی۔ ڈاکٹروں نے چیئرمین ماؤ کی زندگی بچانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر سات روز تک موت و حیات کی کشمکش میں رہنے کے بعد وہ 9 ستمبر 1976ء کو اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ اُن کے جسد خاکی کو بیجنگ کے عظیم عوامی ہال میں رکھا گیا اور 18 ستمبر 1976ء کو Tiananman Sqare میں اُن کی یاد میں تقریب منعقد کی گئی اور تین منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی اور بعد میں ماؤزے تنگ کے نام پر تعمیر کئے گئے خصوصی مقبرہ میں انہیں دفن کر دیا گیا۔

شاہ عبدالعزیز ابن سعود

SHAH ABDUL AZIZ IBN SAUD

موجودہ سعودی عرب کے بانی

سعودی عرب کے فرمانروا شاہ عبداللہ کے والد اور موجودہ سعودی عرب کے بانی شاہ عبدالعزیز بیسوی صدی کے انتہائی بہادر، متحرک اور زیرک حکمرانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے سعودی عرب کو دنیا کا ایک جدید اور امیر ملک بنانے میں انتہائی کردار ادا کیا۔

شاہ عبدالعزیز کا پورا نام عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن ابن سعود تھا لیکن وہ اپنے آپ کو صرف ابن سعود کہلانا پسند کرتے تھے۔ اُن کی والدہ کا نام سارا ال سودیری تھا۔

شاہ عبدالعزیز عرب کے معروف شہر ریاض میں 15 رجنوری 1876ء کو سعودی خاندان میں پیدا ہوئے جو اُس زمانے میں سنٹرل عرب کے علاقے نجد میں واقع تھا۔ بعض کتب میں اُن کی پیدائش کا سن مختلف ہے۔ سعودی خاندان سرزمین عرب کے بیشتر علاقہ پر برسوں سے حکمرانی کر رہا تھا مگر 1890ء میں ال رشید حکمرانوں کے ہاتھوں شکست کے بعد سعود خاندان کو جلاوطنی کی زندگی اختیار کرنا پڑی۔ اُس وقت عبدالعزیز کی عمر 15 برس تھی۔ ابتداء میں اُن کے خاندان نے ایک عربی بدو قبیلہ ال مراہ (Al Murrah) کے ہاں جنوبی عرب کے ایک صحرا میں پناہ لی بعد میں سعود خاندان قطر منتقل ہو گیا اور وہاں دو ماہ تک قیام کیا۔ ان کا اگلا قیام بحرین میں تھا جو انتہائی مختصر رہا۔ بعد ازاں وہ کویت منتقل ہو گئے جہاں وہ تقریباً دس برس تک مقیم رہے۔ اس طرح شاہ عبدالعزیز کا اپنا بچپن کویت میں گزرا۔ ان کے والد عبدالرحمٰن کو ترکی کی سلطنت کی طرف سے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ شاہ عبدالعزیز کو کویت کے امیر مبارک ال صباح کی مجلس میں روزانہ جانے کا موقع ملتا تھا جن سے

انہوں نے امورِ مملکت اور دیگر دنیاوی معاملات کے بارے میں بہت کچھ سیکھا۔ کویت میں عبدالعزیز اپنے والد عبدالرحمٰن کے علاوہ پانچ بھائیوں اور ایک بہن کے ہمراہ رہائش پذیر رہے۔ جلاوطنی کے زمانے میں ابن سعود کے ذہن میں ہر وقت یہ خیال زندہ رہتا تھا کہ وہ کس طرح اپنے آباءاجداد کی کھوئی ہوئی حکمرانی کو واپس لے سکیں اور وہ اس مقصد کے لئے ہر ممکن جدوجہد کرتے رہتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ اپنے آبائی شہر ریاض کو ال رشید خاندان کے قبضہ سے چھڑانے میں کامیاب ہو جائیں گے کیونکہ نجد کے لوگ ال سعود خاندان سے محبت کرتے ہیں اور وہ ریاض شہر کی واپسی کے لئے کی جانے والی جنگ میں ابن سعود کی بھرپور حمایت کریں گے۔

1901ء میں عبدالعزیز ابن سعود نے ریاض کی طرف پیش قدمی کا فیصلہ کیا اور اپنے قریبی رشتہ داروں اور دوستوں کو دعوت دی کہ وہ رضا کارانہ طور پر ریاض کو فتح کرنے کی مہم میں شامل ہو جائیں۔ اگرچہ محدود وسائل اور چند جنگجو ساتھیوں کے ہوتے ہوئے اتنی بڑی مہم کا سوچنا بہت مشکل تھا مگر عبدالعزیز ابن سعود کی جرأت، بہادری اور حکمت عملی کے باعث ناممکن کو ممکن بنا دیا گیا۔

دسمبر 1901ء میں عبدالعزیز ابن سعود اپنے چالیس ساتھیوں کے ہمراہ کویت سے روانہ ہوئے اور جنوری 1902ء میں ریاض پہنچ گئے۔ 15 جنوری 1902ء کو انہوں نے ریاض شہر پر حملہ کر دیا۔ یہ دن اُن کی سالگرہ کا دن بھی تھا۔ اپنی بہترین جنگی حکمت عملی کے باعث انہوں نے انتہائی ڈرامائی انداز میں مسقط قلعہ اور ریاض شہر کو فتح کر لیا رات کے وقت ابن سعود نے اپنے ایک کزن عبداللہ بن جلاوی اور دیگر ساتھیوں کے ہمراہ شہر کی فصیل کو ایسی جگہ سے عبور کر لیا جو ایک ایسے شخص کے گھر کے پاس تھی جو کبھی عبدالعزیز کے والد عبدالرحمٰن کے ہاں ملازم رہا تھا جب ریاض پر ال سعود کی حکومت تھی۔ اُس گھر میں عبدالعزیز کو خوش آمدید کہا گیا اور انہیں ریاض کے حکمران اجلان کے بارے میں تمام اہم معلومات فراہم کر دی گئیں۔ جس کے باعث انہیں اجلان کو شکست دینے میں آسانی ہو گئی اور 1902ء کو ریاض عبدالعزیز ابن سعود کی حکمرانی میں آ گیا۔ اجلان اس وقت ابن سود کے ہاتھوں مارا گیا جب قلعہ سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ 1904ء میں عبدالعزیز ابن سعود نجد میں ال رشید خاندان کی گرفت کو توڑنے میں کامیاب ہو گئے اور اُنہیں شمالی نجد میں جبل شمار کی طرف پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ ال رشید کو مدد کے لئے ترک حکومت سے اپیل کرنا پڑی۔ ابن رشید نے سلطنت عثمانیہ سے اپیل کی کہ وہ اُن کو فوجی امداد فراہم کریں جس پر ترک سلطنت نے اپنی فوجیں عرب بھیج دیں۔ 15 / جون 1904ء کو ابن سعود کی فوج کو ابن رشید اور ترک سلطنت کی مشترکہ فوج



کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہونا پڑا مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری اور گوریلا جنگ شروع کر دی اور صرف دو برس کے اندر وہ اس قابل ہو گئے کہ اپنی شکست کا بدلہ لے سکیں۔ ترک فوج کی مدد سے ال رشید مختصر عرصہ کے لئے ہی نجد میں اپنی حکمرانی قائم رکھ سکے۔ ادھر عبدالعزیز ابن سعود نے اپنی حکمرانی کی حدیں وسیع کرنے کے لئے ایک طرف تو سفارتی مذاکرات کی راہ اپنائی تو دوسری جانب گوریلہ کارروائیوں کا سلسلہ تیز کر دیا۔ نیتجتاً 1906ء میں ال رشید کے انتقال پر ترک فوج کو نجد سے واپس جانا پڑا اور عبدالعزیز ابن سعود کو نجد پر مکمل کنٹرول حاصل ہو گیا۔ بعدازاں عبدالعزیز نے خلیج عرب کے علاقہ ال حفصا کی طرف توجہ مبذول کی جو کہ اب تک ترک حکومت کے کنٹرول میں تھا۔ کئی سال کی جدوجہد کے بعد 1913ء میں عبدالعزیز ابن سعود نے ال حفصا کو بھی فتح کر لیا۔

1912ء میں نجد اور مشرقی ساحلی عرب کے تمام علاقوں پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے کے بعد انہوں نے سلفی علماء کی اجازت سے اخوان کے نام سے ایک مذہبی فوجی گروپ قائم کیا جو بعد کی جنگوں میں اُن کے بہت کام آیا۔ اسی سال انہوں نے Agrarian Policy تشکیل دی جس کا مقصد خانہ بدوش بدوؤں کو رہائش کالونیوں میں آباد کرنا تھا اور اُن کی تمام قبائلی تنظیموں کو ختم کر کے انہیں ''اخوان'' کی اطاعت میں لانا تھا۔

1916ء میں عبدالعزیز ابن سعود نے برطانوی حکومت کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیا جسے Treaty of Darin کا نام دیا گیا۔ اس کے تحت سعودی حکمرانی والے علاقوں کو برطانوی نگہبانی میں دے دیا گیا اور نئی سعودی ریاست کی سرحدوں کا تعین کر دیا گیا۔ اس سے قبل برطانوی حکومت حجاز کے حکمران شریف حسین بن علی کی حمایت کرتی تھی جس میں عبدالعزیز ابن سعود کو نجد اور ال حفصا کا بلاشرکت غیرے حکمران تسلیم کر لیا گیا۔ اس معاہدہ نے عبدالعزیز کو یہ اختیار دے دیا کہ وہ ال رشید خاندان کی باقی ماندہ علاقوں پر حکمرانی کو بھی ختم کر سکیں۔ 1918ء میں انہیں مزید کامیابی حاصل ہوئی اور ال رشید کے دارالحکومت ہیل (Hail) کے اطراف کے علاقے بھی ان کے کنٹرول میں آ گئے۔

1920ء میں عبدالعزیز ابن سعود نے آسیر (Asir) کو بھی فتح کر لیا۔ آئندہ برس انہوں نے ہیل پر فیصلہ کن یلغار کی اور فتح مند ہوئے۔ 1922ء میں نجد پر انہیں مکمل کنٹرول حاصل ہو گیا تاہم عبدالعزیز ابن سعود نے حجاز کی طرف فی الوقت پیش قدمی نہ کی اور ''دیکھو اور انتظار کرو'' کی پالیسی پر عمل کیا۔ 1925ء میں جب شریف حسین آف مکہ برطانوی حکومت کے ساتھ اپنے تعلقات



شاہ عبدالعزیز کی ایک یادگار تصویر



شاہ عبدالعزیز اور امریکی صدر ایف ڈی روزویلٹ ایک میٹنگ کے دوران

استوار نہ رکھ سکا اور مقدس شہروں کا انتظام وانصرام برقرار نہ رکھ سکا تو موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے عبدالعزیز ابن سعود نے شریف حسین کے خلاف فیصلہ کن کارروائی کی اور حجاز پر بھی قبضہ کرلیا۔ اس طرح سلطان آف نجد اور کنگ آف حجاز کا لقب اختیار کرتے ہوئے خادم حرمین الشریفین ہونے کا اعزاز حاصل کرلیا۔ اس کے ساتھ ہی کنگڈم آف سعودی عریبیہ (Kindom of Saudi Arabic) کی بنیاد بھی رکھ دی گئی لیکن کنگڈم آف سعودی عریبیہ کا باضابطہ اعلان 23/ستمبر 1932ء کو کیا گیا جسے دنیا کے بیشتر ممالک نے فوری طور پر تسلیم کرلیا۔

انہوں نے اپنا دفتر اور رہائش Murabba Palace میں منتقل کر لی اور 1953ء میں اپنی وفات تک وہ اسی محل میں رہے۔

1938ء میں سعودی عرب میں تیل دریافت ہو گیا اور شاہ عبدالعزیز نے تیل کی اس دولت سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لئے اپنے مشیر سینٹ جان فلبی (St. John Phulby) کے ذریعے امریکہ کی اہم کمپنیوں کو سعودی آئل فیلڈز (Saudi Oil Fields) کے ٹھیکے دے دیئے جس سے سعودی عرب کی اقتصادی حالت بہت مستحکم ہوگئی۔

شاہ عبدالعزیز نے اندرون ملک باہم برسرپیکار قبائل کو اپنی دشمنیاں ختم کر کے امن وشانتی کے ساتھ ملک کی تعمیر وترقی میں کردار ادا کرنے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے اپنی مملکت میں جرائم کی بیخ کنی پر بھی خصوصی توجہ دی اور ان جرائم پیشہ افراد کا خاتمہ کر دیا جو فریضہ حج ادا کرنے اور مقدس مقامات کی زیادت کرنے کے لئے دیگر ممالک سے آنے والے زائرین کو لوٹ لینے کے گھناؤنے جرائم میں ملوث تھے۔

شاہ عبدالعزیز ابن سعود نے دوسری جنگ عظیم میں سعودی عرب کو مکمل طور پر غیر جانبدار رکھا۔ 1948ء کی عرب اسرائیل جنگ میں شاہ عبدالعزیز نے حصہ لیا اور انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ دوسری جنگ عظیم کے آخری مرحلہ پر شاہ عبدالعزیز نے اہم بین الاقوامی شخصیات کے ساتھ خصوصی ملاقاتیں کیں۔ ان میں سے ایک ملاقات امریکہ کے صدر فرینکلن روز ویلٹ سے 14/فروری 1945ء کو ہوئی جو تین روز تک جاری رہی جس نے مستقبل کے سعودی عرب اور امریکہ کے تعلقات کو مضبوط بنیاد فراہم کی۔ دوسری ملاقات فروری 1945ء میں ہی برطانیہ کے وزیراعظم ونسٹن چرچل سے ہوئی مگر یہ ملاقات زیادہ سودمند ثابت نہ ہوئی کیونکہ اس ملاقات میں تمام وقت مسئلہ فلسطین زیر بحث رہا۔

شاہ عبدالعزیز کے بارے میں مختلف تاریخی حوالوں سے بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں 22 خواتین کے ساتھ شادیاں کیں۔ ان کی پہلی شادی 15 برس کی عمر میں ہوئی۔ اُن کی پہلی بیوی جلد وفات پا گئیں۔ 16 برس کی عمر میں انہوں نے دوسری شادی کی جن سے اُن کے پہلے بیٹے ترکی پیدا ہوئے۔ شہزادہ ترکی 1919ء میں محض 19 برس کی عمر میں وفات پا گئے۔ اُن کی والدہ کا نام ودھا نیت محمد بن عقب (Wadha Bint Muhammad Bin Aqab) تھا۔ شاہ عبدالعزیز کی بیویوں سے 45 بیٹے پیدا ہوئے جن میں 36 زبندہ رہے۔ اُن کے ہاں کئی بیٹیاں بھی پیدا ہوئیں۔

شاہ عبدالعزیز ابن سعود اپنی چچی ال جوارا بنت فیصل سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ اُن ہی کی ترغیب پر وہ کویت سے واپس نجد آئے اور اپنے خاندان کی کھوئی ہوئی حکومت واپس لینے کی جدوجہد شروع کی۔ ال جوارا بنت فیصل بہت عالم و فاضل خاتون تھیں۔ شاہ عبدالعزیز اپنی بڑی بہن نوارا (Nuora) سے بھی بڑی عقیدت رکھتے تھے اور اپنے آپ کو اُن کا بھائی کہلانے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ وہ شاہ عبدالعزیز سے ایک برس بڑی تھیں اور شاہ کی زندگی میں ہی وہ وفات پا گئی تھیں۔

15 مارچ 1935ء کو شاہ عبدالعزیز پر ایک قاتلانہ حملہ بھی ہوا تھا جب وہ فریضہ حج ادا کر رہے تھے مگر اللہ نے انہیں محفوظ رکھا۔ اکتوبر 1953ء میں شاہ عبدالعزیز عارضہ قلب کے باعث سخت علیل ہو گئے اور 9 نومبر 1953ء کو حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ وفات کے وقت اُن کی عمر 76 برس تھی۔ اُن کی آخری رسومات طائف میں ادا کی گئیں جبکہ تدفین کے لئے اُنک کا جسد خاکی سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض لایا گیا اور وہیں انہیں سپرد خاک کیا گیا۔

شاہ عبدالعزیز نے سعودی عرب کو ایک مؤثر نظام حکوتم عطاء کیا اور اقتدار پر اپنے خاندان کی گرفت انتہائی مضبوط کر دی جس کے باعث اُن کی وفات کے طویل عرصہ کے بعد بھی بادشاہت اُن کے بیٹوں کے پاس ہی رہی۔ 1953ء میں شاہ عبدالعزیز ابن سعود کی وفات کے بعد اُن کے ولی عہد اور بڑے صاحبزادے سعود بن عبدالعزیز سعودی عرب کے بادشاہ بن گئے اور گیارہ برس تک حکمران رہے۔ 1964ء میں انہوں نے استعفیٰ دے دیا اور فیصل بن عبدالعزیز نے بادشاہت سنبھال لی۔ 25 / مارچ 1975ء کو شاہ فیصل کو اُن کے ایک بھتیجے نے گولی مار کر شہید کر دیا۔ اُن کے بعد اُن کے بھائی خالد بن عبدالعزیز نے عنان حکومت سنبھال لی اور بادشاہ وقت قرار پائے۔

شاہ خالد 13 / جون 1982ء کو وفات پا گئے اور اُن کے بھائی ولی عہد فہد بن عبدالعزیز

سعودی عرب کے بادشاہ بن گئے اور اگست 2005ء میں اُن کے بھائی ولی عہد عبداللہ بن عبدالعزیز نے سعودی بادشاہ اور خادم حرمین الشریفین کی ذمہ داریاں سنبھال لیں اور آج بھی اپنے فرائض بخوبی سرانجام دے رہے ہیں۔ شاہ عبداللہ کے ولی عہد بھی شاہ عبدالعزیز کے ہی بیٹے ہیں اور اُن کا نام سلمان بن عبدالعزیز ہے۔

ولاڈیمیر لینن

VLADIMIR LENIN

سوویت یونین کے بانی اور انقلابی لیڈر

روس کو وسعت دے کر سوویت یونین بنانے والے اور زار بادشاہوں کی بادشاہت سے روسی قوم کو آزاد کرانے والے عظیم انقلابی لیڈر کا نام ولاڈیمیر لینن تھا۔ لینن روس کی پہلی کمیونسٹ حکومت کے سربراہ بھی تھے۔ وہ ایک لاجواب مقرر اور پولیٹیکل سائنٹسٹ بھی تعلیم کئے جاتے تھے۔

لینن 10 / اپریل 1870ء کو روس کے قصبہ Simbirsk میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد Ilya Ulyanov ایک مقامی سکول میں انسپکٹر تھے اور Russian Orthodox Chruch کے پرجوش رکن ہونے کے باعث شدید مذہبی رجحات رکھتے تھے۔ لینن اپنے بڑے بھائی Alexander Ulyanov کے خیالات سے بہت متاثر تھے جنہوں نے لینن کو کارل مارکس کے نظریات سے متعارف کروایا۔ لینن کی ابتدائی تعلیم Simbirsk Gymnasium میں ہوئی۔

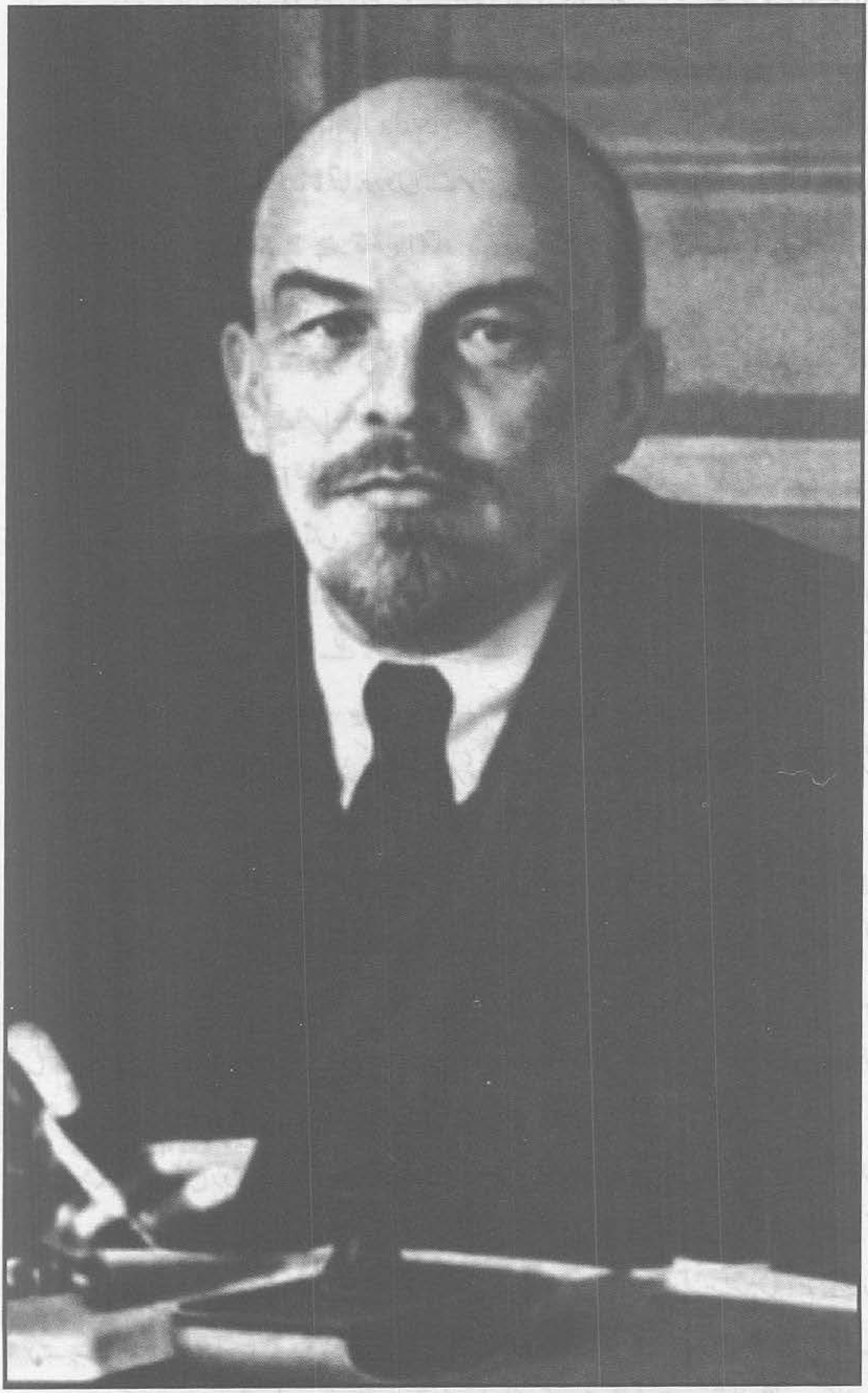
17 / برس کی عمر میں لینن نے یوٹوپین (Utopian) ناول ''کیا کیا جائے'' جسے نکولائی چمشیوسکی (Nickolai Chamyshesiky) نے تحریر کیا تھا کا مطالعہ کیا۔ اپنے بڑے بھائی الیگزینڈر اور کارل مارکس کے علاوہ چمشوسکی کے نظریات کا لینن کی ابتدائی زندگی پر بہت گہرا اثر پڑا۔

1887ء میں لینن کے بھائی الیگزینڈر کو زار بادشاہ الیگزینڈر سوئم کو قتل کرنے کا منصوبہ بنانے کے الزام میں پھانسی دے دی گئی۔

قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے لینن نے کازان یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر لینن کو گرفتار کر لیا گیا اور بعدازاں انہیں یونیورسٹی

سے نکال دیا گیا۔ لینن کو ایکسٹرنل اسٹوڈنٹ کے طور پر سینٹ پیٹرس برگ جا کر تعلیم حاصل کرنا پڑی۔ 1891ء میں قانون کا امتحان پاس کرنے کے بعد لینن نے سامارا (Samara) میں وکالت شروع کر دی۔

1893ء میں لینن سینٹ پیٹرس برگ واپس آئے۔ لینن نے اپنی سیاسی سرگرمیاں جاری رکھیں اور 1895ء میں وہ لبریشن آف لیبر گروپ (Liberation of Labour Group) کے لیڈروں سے ملاقات کے لئے سوئٹزر لینڈ گئے۔ روس واپس آنے پر انہوں نے اپنے دوستوں جول مارٹیو (Jule Martov) اور نادہزدا کروپس کایا (Nadazhda Krupskaya) کے ساتھ مل کر ایک تنظیم قائم کی جسے یونین آف سٹرگل فار دی ایمنیسپشن آف دی ورکنگ کلاس (Union of Strauggle for the Emancipation of the Workeing Class) کا نام دیا گیا۔ 1896ء میں لینن کو گرفتار کر لیا گیا اور سزا کے طور پر سائبیریا (Siberia) بھیج دیا گیا۔ لینن کی قریبی دوست Krupskaya بھی وہیں پہنچ گئیں اور وہاں انہوں نے جولائی 1898ء میں آپس میں شادی کر لی۔ جلاوطنی کے دوران لینن نے کئی اہم کتابیں اور مضامین تحریر کئے۔ اس کے علاوہ دونوں میاں بیوی نے مل کر کئی انگریزی کتابوں کا روسی زبان میں ترجمہ بھی کیا۔ جلاوطنی کے خاتمے پر 1900ء میں لینن نے روس اور یورپ کے شہروں: میونخ، پراگ، ویانہ، مانچسٹر اور لندن کا دورہ کیا لیکن رہائش سوئٹزر لینڈ میں اختیار کی جہاں وہ جنیوا یونیورسٹی میں بطور لیکچرار ملازم ہو گئے۔ یہاں لینن نے ایک اخبار سپارک (Spark) بھی شائع کرنا شروع کیا جس میں وہ انقلابی سیاست کے بارے میں مضامین شائع کرتے تھے۔ 1902ء میں انہوں نے اپنا معروف پمفلٹ ''What to be Done'' شائع کیا جس میں انہوں نے روس سے شہنشاہیت کے خاتمہ کے لئے ایک منظّم سیاسی پارٹی کے قیام پر زور دیا۔ 1905ء میں لینن واپس روس آ گئے تا کہ 1905ء کے روس انقلاب کو سپورٹ کر سکیں۔ 1906ء میں وہ رشین سوشل ڈیموکریٹک لیبر پارٹی کی پریذیڈیم (Presidium) کے لئے منتخب ہو گئے لیکن نومبر کے انقلاب کی ناکامی پر 1907ء میں ایک بار پھر جلاوطنی اختیار کر لی اور پھر 1917ء کے انقلاب تک مغربی یورپ کے ممالک میں ہی مقیم رہے۔ جلاوطنی کے زمانے میں انہوں نے سوشلسٹ سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔ اس دوران انہوں نے اپنی پارٹی کے لئے مالی امداد حاصل کرنے پر بھرپور توجہ دی اور ماسکو سے تعلق رکھنے والی دو ارب پتی شخصیات Maxim Gorky اور Sava Morozov سے خاصی بڑی رقم بطور چندہ لینے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے

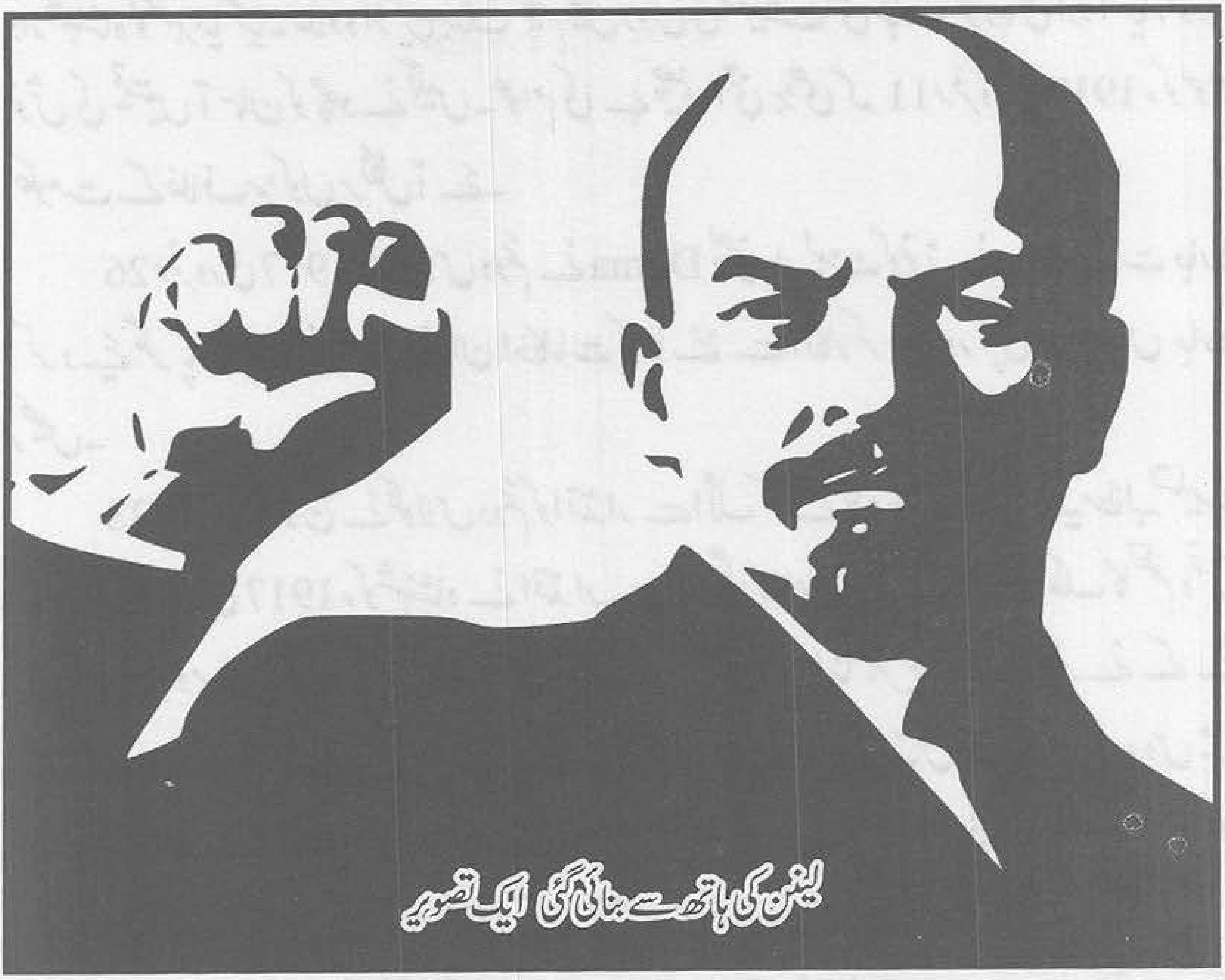


علاوہ Bolsheviks Gangs بھی انہیں بہت بڑی مالی امداد فراہم کرتے تھے جو وہ راہزنی اور ڈکیتی کے ذریعے حاصل کرتے تھے۔ لینن اوران کے ساتھی اس رقم کو انقلابی لٹریچر شائع کرنے پر خرچ کرتے تھے جن میں ایک اہم اخبار Zvezda کی اشاعت بھی شامل تھی۔ اس رقم سے بعض یونینز (Unions) کو بھی خریدا جاتا تھا جو روس کے مرکزی صنعتی شہروں میں مقبولیت رکھتی تھیں۔

1911ء میں لینن اپنے چند قابل اعتماد ساتھیوں کے ہمراہ فرانس چلے گئے اور پیرس (Paris) کے نواح میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہائش اختیار کر لی۔ وہاں انہوں نے Balshevik Party کا ایک سکول بھی قائم کیا جس میں وہ اپنے حامیوں کو ٹریننگ دیتے تھے۔ 1913ء میں لینن اپنی بیوی کے ہمراہ آسٹریا کے شہر Galicia منتقل ہو گئے جہاں اگست کے مہینہ میں انہوں نے Bolsheviks لیڈروں کی ایک کانفرنس منعقد کی جس میں 22 لیڈر شریک ہوئے۔ بعدازاں لینن کو معلوم ہوا کہ ان میں سے پانچ لیڈر روسی حکومت کے ایجنٹ تھے۔ آسٹریا میں قیام کے دوران ہی ایک اور خاتون Inessa Armand لینن کی زندگی میں داخل ہو گئی۔ لینن اس خاتون سے بے پناہ محبت کرنے لگے تاہم انہوں نے اپنی اس محبت کے بارے میں اپنی بیوی Krupskaya کو اعتماد میں لے لیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ Inessa سے ان کا ایک بچہ بھی پیدا ہوا۔ لینن کی بیوی Krupskaya نے لینن کی اس دوسری محبت کے بارے میں 1926ء میں اپنی شائع ہونے والی کتاب Reminisces on Lenion میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

1914ء میں پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا۔ جنگ کے دوران لینن نے اپنی تمام صلاحیتیں اس مہم پر صرف کر دیں کہ حکومتی سطح پر لڑی جانے والی جنگ کو سول وار (Civil War) میں تبدیل کر دیا جائے۔ لینن کا خیال تھا کہ سول وار کے ذریعے روس پر شہنشاہیت کے اثر ورسوخ کو ختم کرنے میں مدد ملے گی اور Bolsheviiks کو حکومت پر قبضہ کرنے کا موقع مل جائے گا۔ انہوں نے اس دوران ایک کتاب "The Highest Stage of Capitalism" بھی شائع کی۔

جنگ عظیم میں روسی فوج کسی بہتر کارکردگی کا مظاہرہ نہ کر سکی بالآخر روس کے شہنشاہ نکولاس دوئم (Nicholas II) نے روسی فوج کی کمان خود سنبھال لی مگر زبردست شکست پھر بھی روسی فوج کا مقدر ٹھہری جس کے باعث 1917ء تک حکومت کی عوام میں حمایت اور مقبولیت تقریباً ختم ہو کر رہ گئی۔ جنگ میں 1917ء تک روسی فوج کے 13 لاکھ جوان ہلاک ہو چکے تھے، 42 لاکھ زخمی ہوئے اور چوبیس لاکھ 17 ہزار فوجی دشمن کے ہاتھوں قیدی بنا لئے گئے۔ فوج کی اس بدترین شکست کا ذمہ



لینن کی ہاتھ سے بنائی گئی ایک تصویر



لینن عوام سے خطاب کرتے ہوئے

دار شہنشاہ کو ٹھہرایا گیا۔ علاوہ ازیں جنگ عظیم میں روس کی معیشت بھی تباہ ہو کر رہ گئی اور اشیاء خورد و نوش کی قیمتیں آسمان کو چھونے لگیں۔ عوام کی بے چینی اتنی بڑھی کہ 11/فروری 1917ء کو عوام حکومت کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے۔

26/فروری 1917ء کو نکولاس دوئم نے Duma یعنی پارلیمنٹ کو توڑنے کے احکامات جاری کر دیئے مگر پارلیمنٹ ممبران نے ان احکامات کو ماننے سے انکار کر دیا اور اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔

28/فروری کو فوج نے نکولاس دوئم کو اقتدار سے الگ کرنے کا مطالبہ کر دیا مگر یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا گیا۔ یکم مارچ 1917ء کو شہنشاہ نے اقتدار سے علیحدگی کا اعلان کرتے ہوئے ملک کا نظم و نسق ایک عبوری حکومت کے حوالے کر دیا۔ لینن ملک کے مستقبل میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کے لئے بے چینی سے وطن واپسی کی کوشش کر رہے تھے۔ جرمن وزارت خارجہ کا خیال تھا کہ لینن کی روس میں موجودگی جنگ کے اختتام میں مدد دے گی اس لئے انہوں نے 27/ مارچ 1917ء کو لینن اور دوسرے بالشوک لیڈروں کی وطن واپسی کے لئے خصوصی ٹرین کی سہولت فراہم کر دی۔

3/اپریل 1917ء کو لینن کی ٹرین Petrograd میں فن لینڈ (Finland) اٹیشن پر پہنچی جہاں اُن کا شاندار استقبال کیا گیا۔ اپریل میں ہی لینن نے بالشوک پارٹی کے لئے اپنے انقلابی پروگرام کا اعلان کیا جو April Theses کے نام سے مشہور ہے۔

اگست 1917ء کو جب لینن ابھی فن لینڈ میں خفیہ طور پر مقیم تھے روسی فوج کے کمانڈر انچیف جنرل Lavr Kornilov نے روس کی عبوری حکومت کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن اسے ناکامی ہوئی۔

اکتوبر 1917ء میں بالشوک پارٹی نے لینن کی قیادت میں عوام کی بھرپور حمایت سے روسی اقتدار پر قبضہ کر لیا اور لینن نئی سوویت ریاست کے سربراہ بن گئے۔ لینن نے ایک انقلابی کونسل قائم کر دی اور بالشوک پارٹی کو کمیونسٹ پارٹی کا نام دے دیا۔

26/اکتوبر 1917ء کو آل ریشین کانگرس آف سوویٹس All Russian Congress of Soviets کا ایک اہم اجلاس منعقد ہوا جس میں تمام اختیارات سوویت انقلابی کونسل کو سونپنے کا فیصلہ ہو گیا۔ لینن کونسل کے چیئرمین منتخب کر لئے گئے جبکہ لینن کے اہم رفقاء کو وزارتی ذمہ داریاں تقسیم کی گئیں لیوں ٹراٹسکی (Leon Trotsky) وزارت خارجہ ایلیکس ری کوو (Alexi

(Rykov وزارت داخلہ، اناتولی (Anatoli) وزارت تعلیم، الیگزینڈرا کولونتائی (Alexandra Kollontai) سماجی بہبود، جوزف سٹالن (Josiph Stalin) قومیتیں (Nationalities)، پیٹرسٹوکا (Peter Stuchka) وزارت انصاف اور انتونو (Antonov) وزارت دفاع کے انچارج مقرر ہوئے۔

لینن نے انقلابی کونسل کے چیئر مین کی حیثیت سے سوویت یونین کے اندر ہر قسم کی نجی ملکیت پر پابندی عائد کر دی اور تمام زمینوں کو سرکاری تحویل میں لے کر کسانوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ تمام بنکوں کو بھی قومی تحویل میں لے لیا گیا اور تمام فیکٹریوں اور کارخانوں کا کنٹرول کارکنوں کے ہاتھوں میں دے دیا۔ آئین ساز اسمبلی کو برطرف کر دیا گیا اور تمام سیاسی جماعتوں پر بھی پابندی لگا دی۔ تمام اہم سیاسی لیڈروں کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ لینن نے فوج کی نقل و حرکت پر بھی پابندی عائد کر دی اور جرمنی کے ساتھ امن معاہدہ کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ دسمبر 1917ء میں لیون ٹراٹسکی کی قیادت میں ایک وفد اس مقصد کے لئے جرمنی اور آسٹریا کے نمائندوں سے ملاقات کے لئے روانہ ہو گیا۔ لینن کی خواہش تھی کہ سوویت یونین کے زیر اثر علاقے کھوئے بغیر وہ مخالفین سے امن معاہدہ کر لیں مگر ایسا ممکن نہ ہو سکا اور 3/ مارچ 1918ء کو اس کی حکومت کو ایک معاہدہ پر دستخط کرنا پڑے جس کے نتیجہ میں روس کو یوکرائن، فن لینڈ، پولینڈ اور بالٹک صوبوں سے ہاتھ دھونا پڑے۔ لینن کے اس اقدام سے پورے روس میں زبردست مایوسی اور بے چینی پھیل گئی اور لینن حکومت کے خلاف مظاہرے شروع ہو گئے۔ جنرل کورنیلوو (General Kornlov) نے حکومت کی مزاحمت کے لئے رضا کار فوج کے قیام کا اعلان کر دیا جس نے بعد ازاں سفید فام فوج کا نام اختیار کر لیا۔ سفید فام فوج میں دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں لوگ شامل ہو گئے اور اس طرح ملک میں خانہ جنگی (Civil War) کا آغاز ہو گیا۔

30/ اگست 1918ء کو ایک خاتون Dora Kaptan نے لینن پر قاتلانہ حملہ کیا جس کے نتیجہ میں لینن کے جسم میں دو گولیاں پیوست ہو گئیں۔ لینن کی جان تو بچ گئی مگر ان کی صحت روز بروز گرنے لگی۔ لینن نے فیصلہ کیا کہ کمیونسٹ پارٹی کو کنٹرول کرنے کے لئے اسے اپنے ساتھ کسی اور اہم عہدیدار کو بھی رکھنا چاہئے اس فیصلہ کی روشنی میں اپریل 1922ء میں لینن نے کمیونسٹ پارٹی کے لئے ایک سیکرٹری جنرل کا عہدہ متعارف کروایا اور جوزف سٹالن کو پارٹی کا سیکرٹری جنرل مقرر کر دیا جنہوں نے ماضی میں ہمیشہ لینن کی پالیسیوں کی دیانتداری سے بھرپور حمایت کی تھی۔ کمیونسٹ

پارٹی میں کسی بھی لیڈر نے جوزف سٹالن کی بطور سیکرٹری جنرل نامزدگی کی مخالفت نہ کی۔ سیکرٹری جنرل بن جانے پر سٹالن کی پوزیشن پارٹی میں بہت مضبوط ہوگئی۔ جب لینن بیماری کے باعث لاغر ہو گئے تو سٹالن نے اپنی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کیا اور عملاً پارٹی اور حکومت کے تمام معاملات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ آنے والے دنوں میں لینن کو اس بات کا خدشہ محسوس ہونے لگا کہ سٹالن کہیں ضرورت سے زیادہ طاقتور نہ بن جائے اور انہوں نے اپنے قابل اعتماد ساتھیوں سے مشورہ بھی کیا کہ کس طرح سٹالن کی حیثیت کو کم کیا جاسکتا ہے خاص طور پر لیون ٹراٹسکی کی مدد اس مقصد کے لئے حاصل کی گئی مگر اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ اکتوبر 1922ء میں سٹالن نے بیرونی تجارت کے معاملہ پر لینن کی کھل کر مخالفت کر دی اور جب کمیونسٹ پارٹی کی سینٹرل کمیٹی میں یہ معاملہ زیر بحث آیا تو لینن کی بجائے سٹالن کے مؤقف کو پارٹی ممبران کی طرف سے زیادہ حمایت حاصل ہوئی۔ پارٹی کانگرس نے سٹالن کو بطور سیکرٹری جنرل یہ اختیارات بھی دے دیئے کہ وہ پارٹی سے غیر فعال اور ناپسندیدہ ممبران کو نکال باہر کر سکیں۔ ان اختیارات سے سٹالن نے خوب فائدہ اٹھایا اور اپنے ہزاروں مخالفین کو پارٹی سے نکال دیا۔ لینن کی خواہش کے برعکس لینن کی بے بسی میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ اپنی وفات سے 10 ماہ قبل لینن کو دل کا شدید دورہ پڑا جس نے انہیں عملاً مفلوج کر دیا۔ وہ بولنے اور لکھنے کے قابل نہ رہے۔ اقتدار کے ایوانوں میں اُن کا عمل دخل ختم ہو کر رہ گیا۔ تمام تر طاقت سٹالن کے ہاتھ آ گئی۔

بالآخر 21 جنوری 1924ء کو لینن 53 برس کی عمر میں اس دنیا فانی سے کوچ کر گئے۔ نو لاکھ افراد نے لینن کا آخری دیدار کیا جن میں بیرون ممالک سے متعدد اہم شخصیات بھی شامل تھیں۔ لینن کی وفات کے تین روز بعد پیٹروگراڈ (Petrograd) شہر کا نام لینن گراڈ (Leningrad) رکھ دیا گیا جو 1991ء تک سوویت یونین کے اختتام تک برقرار رہا۔ لینن ایک بہترین مقرر اور لکھاری تھے ان کی شخصیت اور تحریروں نے دنیا بھر میں لاکھوں ذہنوں اور دلوں میں اپنی جگہ بنائی۔ ان کی تحریروں کا دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ ان کی وفات کے بعد ان کی جدوجہد اور کامیابیوں کے حوالے سے کئی فلمیں بنائی گئیں۔ سوویت حکومت نے نوبل پرائز کے مقابلہ میں بیش بہا قیمتی لینن پرائز کا اجراء کیا۔

کم اِل سُنگ

KIM IL SUNG

کم ال سنگ عوامی جمہوریہ کوریا جسے عام لوگ شمالی کوریا کے نام سے جانتے ہیں کے عظیم لیڈر تھے۔ عوام جمہوریہ کوریا کے عوام کے دلوں اور ذہنوں میں کم ال سنگ کا وہی مقام ہے جو عوام جمہوریہ چین میں چیئرمین ماؤزے تنگ کو حاصل ہے۔ کم ال سنگ نے کوریا کو جاپان کے تسلط سے آزادی دلوائی اور بعدازاں اپنے ملک کو ایک مضبوط فوجی طاقت اور ایٹمی ٹیکنالوجی سے لیس مملکت بنا دیا۔ اگرچہ اس عمل میں انہیں بین الاقوامی سطح پر شدید تنقید اور مزاحمت کا سامنا بھی کرنا پڑا مگر انہوں نے کسی چیز کی پرواہ کئے بغیر اپنے مشن کو جاری رکھا۔ کم ال سنگ اپنی وفات کے بعد بھی شمالی کوریا کے عوام کے دلوں میں زندہ ہیں اور لوگ لاکھوں کی تعداد میں روزانہ دارالحکومت پیانگ یانگ میں نصب ان کے ''مجسمہ'' کے سامنے حاضر ہو کر ان کے ساتھ اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔

کم ال سنگ 1948ء میں عوامی جمہوریہ کوریا کے قیام سے لے کر 1994ء میں اپنی وفات تک بلاشرکت غیرے امور مملکت کے سیاہ و سفید کے مالک رہے۔ 1948ء سے 1972ء تک وہ عوامی جمہوریہ کوریا کے وزیراعظم اور 1972ء میں اپنی زندگی کے اختتام تک صدر مملکت رہے۔ شمالی کوریا کی حکمران جماعت ''ورکرز پارٹی آف کوریا'' کی سربراہی بھی 1949ء سے 1994ء تک اُن کے پاس رہی۔ 1949ء سے 1966ء تک وہ ورکرز پارٹی کے چیئرمین رہے جبکہ 1966ء سے 1994ء وہ پارٹی کے سیکرٹری جنرل رہے۔ ان برسوں کے دوران ورکرز پارٹی کے تمام اختیارات کا منبع سیکرٹری جنرل کا عہدہ تھا۔ شمالی کوریا اور جنوبی کوریا کو یکجا کر کے ایک مکمل اور خودمختار ملک بنانے کی خواہش کے تحت انہوں نے 1950ء میں اپنی افواج جنوبی کوریا کی آزادی کے لئے، بھجوائیں جو

کہ بقول کم ال سنگ کے امریکہ کے زیر اثر اتحادی افواج کے قبضہ میں تھا۔ یہ جنگ 1950ء سے 1953ء تک جاری رہی مگر کم ال سنگ کوریا کے دونوں حصوں یعنی شمالی کوریا اور جنوبی کوریا، کو متحد کر کے ایک ملک بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ جنگ کورئن وار (Korean War) کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے۔

کم ال سنگ کے عوامی جمہوریہ کوریا پر مسلسل اقتدار کے عرصہ کو تاریخ دان اس طرح بھی یاد کرتے ہیں کہ وہ سوویت یونین کے سربراہ جوزف سٹالن کی وفات کے چالیس برس، عوامی جمہوریہ چین کے سربراہ ماؤزے تنگ کی وفات کے بیس برس، جنوبی کوریا کے چھ صدور کے عہدہ صدارت کے اختتام، سات سوویت یونین کے صدور کی صدارت کے خاتمے، دس امریکی صدور کے عہدوں کی مدت ختم ہونے۔ چودہ برطانوی وزرائے اعظم کے دور اقتدار کے خاتمے اور بیس جاپانی وزرائے اعظم کے عہدوں کی مدت ختم ہونے کے بعد تک شمالی کوریا کے سربراہ رہے۔ کم ال سنگ کی وفات کے بعد 1994ء میں ان کے بڑے بیٹے کم جان ال اور 2011ء میں کم جان ال کی وفات پر ان کے بیٹے کم جان یُن عوامی جمہوریہ کے صدر بن گئے اس طرح درحقیقت آج بھی کم ال سنگ مرحوم ہی کوریائی اقتدار کے ایوانوں میں موجود ہیں۔

کم ال سنگ 15 اپریل 1912ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام کم ہائی یوگن جک (Kim Hyong Jik) تھا جنہوں نے اپنے پہلے بیٹے کا ابتدائی نام کم سُنگ جو (Kin Sung Ju) رکھا۔ کم ال سنگ کے والد 1926ء میں وفات پا گئے اس وقت کم ال سنگ کی عمر صرف چودہ برس تھی۔

اکتوبر 1926ء میں کم ال سنگ نے ڈاؤن ود امپریلزم یونین (Down with Imperialism Union) کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ 1926ء میں ہی انہوں نے واسنگ ملٹری اکیڈمی میں داخلہ لے لیا مگر اکیڈمی میں ملٹری ٹریننگ کے معیار سے مطمئن نہ ہوتے ہوئے 1927ء میں اسے چھوڑ دیا۔ 1930ء کے اوائل میں کم ال سنگ کی نظریات میں اچانک تبدیلی آ گئی وہ کمیونزم (Communism) کے زبردست حامی بن گئے۔ ان خیالات کے باعث انہیں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔

1931ء میں کم ال سنگ نے ''کمیونسٹ پارٹی آف چائنا'' میں باضابطہ شمولیت اختیار کر لی۔ اس کے علاوہ انہوں نے جاپانی حکومت کے خلاف کام کرنے والے کئی گوریلا گروپوں کی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔ 1935ء میں انہوں نے نارتھ ایسٹ اینٹی جیپنیز یونائیٹڈ آرمی



(North East Anti Japnese United Army) کی رکنیت حاصل کر لی۔ یہ ایک گوریلا تنظیم تھی جسے کمیونسٹ پارٹی آف چائنا کی مکمل حمایت حاصل تھی۔

1935ء میں کم ال سنگ نے اپنا ابتدائی نام تبدیل کر کے موجودہ نام اپنا لیا باقی ماندہ زندگی میں یہی نام ان کی پہچان رہا۔

1937ء میں 24 برس کی عمر میں کم ال سنگ کو 6th ڈویژن کا کمانڈر مقرر کر دیا گیا جو چند سو گوریلا جوانوں پر مشتمل تھی۔ بعد میں یہ ڈویژن کم ال سنگ ڈویژن کے نام سے ہی مشہور ہوگئی۔

4/جون 1938ء کو کم ال سنگ ڈویژن نے کوریا کے اندر ایک جاپانی چوکی پر حملہ کیا اور کچھ عرصہ کے لئے وہاں پر اپنا قبضہ برقرار رکھا۔ کم ال سنگ کے اس اقدام کو ایک اہم فوجی کامیابی تصور کیا گیا اور چینی گوریلوں کی نظر میں کم ال سنگ کی اہمیت بڑھ گئی۔ کم ال سنگ کو فرسٹ آریم کے دوسرے ریجنل آپریشن کا کمانڈر مقرر کر دیا گیا۔ 1940ء کے آخر تک کم ال سنگ فرسٹ آرمی کے وہ واحد فرد تھے جن کی زندگی کا اختتام نہیں ہوا تھا۔ جاپانی فوجوں کے ہاتھوں تمام جوان ہلاک ہو گئے تھے کم ال سنگ کی جان بھی اس لئے بچ گئی کہ وہ دریائے امور (Amur River) عبور کر کے سوویت یونین کی حدود میں داخل ہو گئے تھے۔ سوویت حکومت کی طرف سے کم ال سنگ کو خاباروسک (Khabarousk) کے مقام پر قائم ایک کیمپ میں بھیج دیا گیا جہاں کورین کمیونسٹ گوریلوں کو ٹریننگ دی جا رہی تھی۔ کم ال سنگ کو سوویت ریڈ آرمی میں میجر (Major) کے عہدہ پر ترقی دے دی گئی اور اس حیثیت سے انہوں نے دوسری جنگ عظیم کے اختتام تک خدمات سرانجام دیں۔

اگست 1945ء میں جب سوویت یونین نے جاپان کے خلاف جنگ کا آغاز کر دیا تو سوویت فوجوں نے کوریا کی طرف بھی پیش قدمی شروع کر دی۔ 15/اگست 1947ء کو بغیر کسی بڑی مزاحمت کے روسی فوجوں نے کوریا کے دارالحکومت پیانگ یانگ پر قبضہ کر لیا۔ اس صورت حال میں کم ال سنگ اپنی 26 برس کی جلاوطنی ختم کر کے کوریا پہنچ گئے اور سوویت یونین کی مکمل تائید سے کوریا کی عبوری حکومت کے وزیراعظم بن گئے۔ کم ال سنگ کی اس کامیابی کا بنیادی سبب ان کی طرف سے ایک پروفیشنل آرمی جسے ''کورین پیپلز آرمی'' کا نام دیا گیا کا قیام تھا جس نے کوریا کی جنگ آزادی میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد اتحادی ممالک کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ کوریا میں اقوام متحدہ



کم ال سنگ اپنے صاحبزادے کم جان ال اور فوجی افسران کے ہمراہ



کم ال سنگ امریکی صدر جمی کارٹر کے ہمراہ

کے زیر اہتمام عام انتخابات منعقد کروائے جائیں گے مگر انتخابات کے انعقاد سے قبل ہی امریکہ کے زیر اثر کوریا کا جو علاقہ موجود تھا اسے مئی 1948ء میں ''ریپبلک آف کوریا'' کا نام دے کر آزاد ملک قرار دے دیا گیا جبکہ 9ستمبر 1948ء کم ال سنگ کے کنٹرول میں رہ جانے والے کوریا کو ''عوامی جمہوریہ کوریا'' کا نام دے دیا گیا اور کم ال سنگ عوامی جمہوریہ کوریا کے باضابطہ وزیراعظم بن گئے۔

12اکتوبر 1948ء کو سوویت یونین نے عوامی جمہوریہ کوریا کو تسلیم کرلیا۔ 1949ء میں کم ال سنگ نے ''ورکرز پارٹی آف نارتھ کوریا'' کے قیام کا اعلان کر دیا اور اسے ملک کی واحد سیاسی جماعت قرار دے دیا۔ ورکرز پارٹی 1949ء سے اب تک عوامی جمہوریہ کوریا کی حکمران جماعت بھی ہے۔

1950ء سے 1953ء تک جاری رہنے والی کورین جنگ نے عوامی جمہوریہ کوریا کی معیشت پر نہایت برے اثرات مرتب کئے۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد وزیراعظم کم ال سنگ نے کوریا کی تعمیر و ترقی کے لئے ایک پانچ سالہ اقتصادی منصوبہ کا اعلان کیا۔ ملک میں بڑی بڑی صنعتیں قائم کی گئیں اور خاص طور پر دفاعی پیداوار پر توجہ مرکوز کی گئی۔ غیر ملکی فوجی دستوں کو ملک سے نکال دیا گیا اور 1957ء تک عوامی جمہوریہ کوریا میں کسی بھی ملک کا کوئی فوجی دستہ موجود نہ رہا۔

کم ال سنگ نے سوشلسٹ بلاک سے تعلق رکھنے والے تمام ممالک سے خصوصی تعلقات قائم کئے خاص طور پر مشرقی جرمنی اور رومانیہ ان کے بہترین دوست بن گئے۔

1972ء میں عوامی جمہوریہ کوریا کے نئے آئین کا نفاذ عمل میں لایا گیا جس کے تحت کم ال سنگ نے صدر مملکت کا عہدہ سنبھال لیا۔

1980ء میں کم ال سنگ نے فیصلہ کیا کہ ان کے بعد اُن کے بڑے بیٹے کم جان ال عوامی جمہوریہ کوریا کے صدر کا عہدہ سنبھالیں گے اور زیادہ تر امور مملکت انہوں نے کم جان ال کے سپرد کر دیئے۔ اکتوبر 1980ء میں حکمران جماعت ورکرز پارٹی کی چھٹی کانگرس میں کم جان ال کو باضابطہ طور پر کم ال سنگ کا جانشین قرار دے دیا گیا۔

1989ء سے لے کر 1991ء تک مشرقی یورپ اور سوویت یونین میں کمیونزم کی ناکامی سے عوامی جمہوریہ کوریا کو سخت نقصان ہوا اور اسے شدید اقتصادی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ادھر عمر بڑھنے کے باعث کم ال سنگ کی صحت بھی خراب رہنے لگی۔ 1991ء سے 1993ء کے درمیانی عرصہ میں کم ال سنگ نے اپنے بیٹے کم جان ال کو نیشنل ڈیفنس کمیشن کی چیئرمین شپ بھی سونپ دی

یہ کمیشن کوریا کی دس لاکھ سے زیادہ افراد پر مشتمل فوج کو کنٹرول کرتا ہے۔ 8 جولائی 1994ء کو عظیم لیڈر کم ال سنگ کو دل کا شدید دورہ پڑا کوریا کے طول وعرض سے بلائے گئے ڈاکٹروں نے اپنے محبوب لیڈر کی جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر انہیں کوئی کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ چند گھنٹے موت و حیات کی کشمکش میں رہنے کے بعد کم ال سنگ اس دنیا سے چل بسے۔ وفات کے وقت کم ال سنگ کی عمر 82 برس تھی۔ کم ال سنگ کی وفات کے تیس گھنٹے بعد سرکاری طور پر ان کے اپنی عوام سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جانے کا اعلان کیا گیا۔ حکومت نے اپنے لیڈر کی وفات پر دس روزہ سوگ کا اعلان کیا۔ ان کی تدفین کی رسومات میں کوریا کے کونے کونے سے پیانگ یانگ پہنچ کر شریک ہونے والے غم زدگان کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ ان کے جسد خاکی کو ایک عوامی عجائب گھر میں دیدار عام کے لئے رکھ دیا گیا۔

کم ال سنگ نے اپنی زندگی میں دو بار شادی کی۔ ان کی پہلی بیوی کم جانگ سک (Kim Jang Suk) سے ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ بڑے بیٹے کم جان ال تھے جبکہ دوسرے بیٹے کا نام کم مین ال تھا جو 1947ء میں سوئمنگ کرتے ہوئے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اُن کی بیوی محض 31 برس کی عمر میں انتقال کر گئیں۔ دوسری شادی انہوں نے 1951ء میں کم سانگ ائی (Kimg Song-ae) سے کی جس سے اُن کے تین بچے پیدا ہوئے۔

کم ال سنگ کا نام عوام جمہوریہ کوریا کی تاریخ میں ہمیشہ سنہری حروف کے ساتھ موجود رہے گا۔ شمالی کوریا کے طول وعرض میں اُن کے پانچ سو سے زائد مجسمے نصب ہیں جو عوام کو ہمیشہ ان کی یاد دلاتے رہتے ہیں۔

چارلس ڈیگال
(CHARLES DE GAULLE)

جنرل ڈیگال فرانس کے عظیم جرنیل اور قومی لیڈر تھے جنہوں نے دوسری جنگ عظیم کے دوران فرانس کو جرمن فوجوں کے قبضہ سے چھڑا کر فرانس کو ایک بار پھر آزاد اور خودمختار ملک بنانے کا اعزاز حاصل کیا بعدازاں فرانس کے صدر کی حیثیت میں اپنے ملک اور قوم کے لئے اس قدر عظیم خدمات سرانجام دیں کہ فرانسیسی قوم رہتی دنیا تک شاید انہیں فراموش نہ کر سکے۔ جنرل ڈیگال کو پانچویں فرنچ ریپبلک (Fifth French Republic) کا بانی ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔

جنرل ڈیگال جن کا اصل نام چارلس آندرے جوزف میری دی گول (Charles Andre' Joseph Maerie de Gaulle) تھا۔ 1890ء میں فرانس کے شہر لیل (Lille) میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے پانچ بہن بھائیوں میں سے تیسرے نمبر پر تھے ان کے والد ہنری ڈی گال تاریخ اور ادب کے پروفیسر تھے بعد میں انہوں نے اپنا ایک الگ تعلیمی ادارہ قائم کرلیا۔ ان کا خاندان کیتھولک کرسچین تھا مگر وہ خاصے ترقی پسند اور حب الوطن تھے۔

چارلس ڈیگال نے پیرس میں اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کی۔ وہ ایک ہونہار طالبعلم تھے۔ 1912ء میں انہوں نے ملٹری اکیڈمی سینٹ گر سے نمایاں حیثیت میں گریجوایشن کی۔ 1913ء میں جنرل ڈیگال نے سیکنڈ لیفٹیننٹ کے طور پر فوج میں کمیشن حاصل کیا۔ جنرل ڈیگال ایک دراز قد فوجی افسر تھے ان کا قد 6 فٹ پانچ انچ تھا۔

پہلی جنگ عظیم میں جنرل ڈیگال نے بھرپور حصہ لیا اور جنگ کے ابتدائی چند مہینوں میں وہ دو بار شدید زخمی بھی ہوئے۔ فروری 1915ء میں انہیں کیپٹن کے عہدہ پر ترقی دے دی گئی۔ 2/ مارچ



1915ء کو وہ ایک بار پھر جرمن فوجوں سے لڑتے ہوئے شدید زخمی ہوئے۔ 1916ء میں وہ جرمن فوج کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے اور آئندہ 32 ماہ تک انہیں مختلف جیلوں میں جنگی قیدی کے طور پر رکھا گیا۔ اس دوران انہوں نے پانچ مرتبہ جیل سے فرار ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ جرمن اور فرانس کے درمیان معاہدہ امن کے بعد ڈیگال کو فرانس میں قائم کردہ ایک پولش ڈویژن (Polish Devision) میں خدمات سرانجام دینے کے لئے بھیج دیا گیا۔ انہوں نے سول وار (Civil War) کے دوران ریڈ آرمی (Red Army) کے خلاف بھرپور اور مؤثر کارروائیاں کیں جن کے باعث انہیں پولینڈ حکومت کی جانب سے اعلیٰ ترین فوجی اعزاز دیا گیا۔

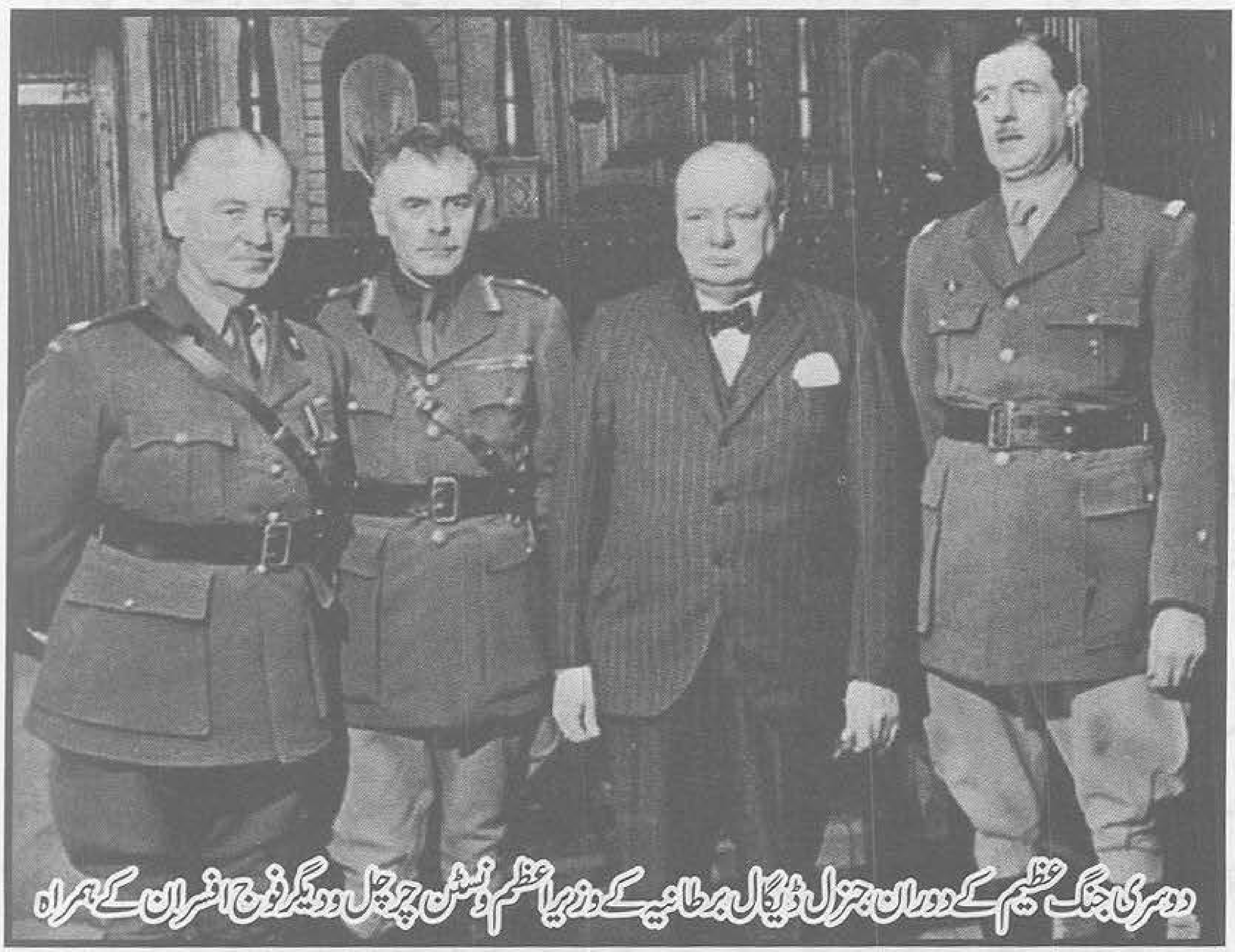
ڈیگال نے فرنچ وار کالج میں کچھ عرصہ تک بطور لیکچرار بھی خدمات سرانجام دیں۔ فرانسیسی فوج کے بارے ڈیگال کے خیالات کیا تھے اور وہ فرانسیسی فوج کو کس انداز میں دیکھنا چاہتے تھے اس کا اظہار انہوں نے 1934ء میں شائع ہونے والی اپنی کتاب ''دی آرمی آف فیوچر'' (The Army of Future) میں کھل کر کیا ہے۔ اس وقت کی فرانسیسی حکومت اور فوج ڈیگال کے نظریات کے سخت خلاف تھیں لہٰذا انہوں نے ڈیگال کو اپنے نظریات کے اظہار پر سزاوار ٹھہرایا اور فوج میں ان کی ترقی روک دی۔ 1938ء میں ڈیگال کی ایک اور کتاب ''فرانس اور اس کی فوج'' (France and Her Army) منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کی بھی فوجی جرنیلوں نے شدید مخالفت کی۔

دوسری جنگ عظیم کے آغاز پر ڈیگال کو فرانس کی ففتھ آرمی (5th Army) کی کمان سونپ دی گئی۔ کچھ عرصہ بعد انہیں فورتھ ارموڈ ڈویژن (4th Armoured Diviion) کی کمانڈ سونپی گئی جس میں 200 ٹھینک بھی شامل تھے۔ ڈیگال نے جرمن فوجوں کی پیش قدمی کو مؤثر طریقے سے روکا۔ 26 رمئی 1940ء کو ڈیگال فرانسیسی فوج کے وہ واحد کمانڈر بن گئے جنہوں نے جرمن فوج کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔

5 رجون 1940ء کو فرانسیسی وزیراعظم پال رینود (Paul Reynaud) نے ڈیگال کو فرانس کا وزیر دفاع مقرر کر دیا۔ ڈیگال برطانیہ کے دورہ پر لندن چلے گئے جہاں 16 رجون 1940ء کو انہیں معلوم ہوا کہ مسٹر ہنری فلیپ (Henri-Philippe) نے وزیراعظم کو برطرف کر کے خود وزارت عظمیٰ کا عہدہ سنبھال لیا ہے اور ایک ایسی حکومت قائم کر لی ہے جو جرمنی کے ساتھ امن کا معاہدہ کرنے پر آمادہ ہے۔ نئی حکومت کی جانب سے گرفتاری کے خطرے کے پیش نظر ڈیگال نے لندن میں اپنا قیام بڑھا دیا اور برطانوی ریڈیو پر اپنے ایک خطاب میں انہوں نے فرانسیسی فوج اور عوام کو



صدر چارلس ڈیگال امریکہ کے صدر جان ایف کینیڈی اور انکی اہلیہ کے ہمراہ



دوسری جنگ عظیم کے دوران جنرل ڈیگال برطانیہ کے وزیر اعظم ونسٹن چرچل و دیگر فوج افسران کے ہمراہ

جرمنی کے خلاف جنگ جاری رکھنے کا پیغام دیا۔

امریکہ کے صدر روز ویلٹ نے تو نئی فرانسیسی حکومت کو تسلیم کر لیا مگر برطانوی وزیراعظم چرچل نے نئی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور جنرل ڈیگال کو ہی "آزاد فرانس" کے لیڈر کے طور پر مکمل حمایت دے دی جس پر فرانسیسی وزیراعظم ہنری فلپ نے جنرل ڈیگال کو برطرف کر دیا اور جنرل ڈیگال کے کورٹ مارشل کا حکم دے دیا۔ 4/ جولائی 1940ء کو جنرل ڈیگال کی غیر موجودگی میں ہونے والے کورٹ مارشل میں انہیں چار سال قید کی سزا سنائی گئی جبکہ 2/ اگست 1940ء میں ہونے والے دوسرے کورٹ مارشل میں جنرل ڈیگال کو سزائے موت سنا دی گئی۔

جنرل ڈیگال نے جلاوطنی میں رہتے ہوئے فرانس کی آزادی کے لئے متحرک قوتوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی اور بالآخر مارچ 1943ء میں وہ آٹھ بڑی مدافعاتی قوتوں کو متحد کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ 30/ مئی 1943ء کو جنرل ڈیگال الجزائر منتقل ہو گئے اور اگلے ہی روز انہوں نے فرنچ کمیٹی آف نیشنل لبریشن کے قیام کا اعلان کر دیا۔

26/ مئی 1944ء کو جنرل ڈیگال نے اعلان کر دیا کہ فرنچ کمیٹی آف نیشنل لبریشن فرانس کی عبوری حکومت کہلائے گی جس پر امریکی صدر روز ویلٹ اور برطانوی وزیراعظم چرچل نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور جنرل ڈیگال کی عبوری حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ امریکہ اور برطانیہ کی مخالفت کے باوجود چیکوسلواکیہ، پولینڈ، بلجیم، لیگزمبرگ، یوگوسلاویہ اور ناروے نے جنرل ڈیگال کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔

13/ جولائی 1944ء کو امریکہ اور برطانیہ نے بھی جنرل ڈیگال کی حمایت کر دی۔ جنرل ڈیگال 2 اگست 1944ء کو الجزائر سے فرانس منتقل ہو گئے اور جب 25 اگست 1944ء کو پیرس میں داخل ہوئے تو انہیں امریکی فوج کے ساتھ کام کرنے کی اجازت دی گئی۔ اسی روز انہوں نے ایک عوامی جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے تمام محبّ وطن فوجی تنظیموں کو اپنی حکومت میں شمولیت کی دعوت دے دی جس کا انہیں انتہائی مثبت جواب دیا گیا۔

13/ نومبر 1945ء کو فرانس کی پہلی آئین ساز اسمبلی نے جنرل ڈیگال کو متفقہ طور پر حکومت کا سربراہ منتخب کر لیا۔ سربراہ حکومت کے طور پر جنرل ڈیگال نے 20 جنوری 1946ء تک خدمات سرانجام دیں۔ اس کے بعد انہوں نے ایک الگ سیاسی جماعت ریلی آف فرنچ پیپل (Relly of the French People) قائم کر لی۔ آغاز میں اسے عوام میں مقبولیت حاصل ہوئی مگر وہ دیرپا

ثابت نہ ہوئی بالآخر 1953ء میں جنرل ڈیگال نے اس جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی اور دو برس بعد یہ جماعت اپنا وجود گنوا بیٹھی۔ آئندہ چند برس تک جنرل ڈیگال سیاست سے کنارہ کش رہے اور انہوں نے اپنی یادداشتوں پر مشتمل تین کتابیں مکمل کیں۔

1958ء کے صدارتی انتخابات میں جنرل ڈیگال کو فرانس کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ ان دنوں الجزائر کے مسلمان فرانسیسی تسلط سے آزادی کے لئے جنگ لڑ رہے تھے۔ جنرل ڈیگال نے اگرچہ فرانس کے زیر تسلط 13 افریقی ریاستوں کو مکمل آزادی دے دی مگر الجزائر کی جنگ 1962ء تک جاری رہی۔

1969ء میں طالبعلم تنظیموں کی جانب سے جنرل ڈیگال کی حکومت کے خلاف پُرتشدد ہنگاموں اور پھر ملک گیر ریفرنڈم میں شکست کے بعد جنرل ڈیگال نے اپریل 1969ء کو صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ 9 نومبر 1970ء کو جنرل ڈیگال تقریباً 80 برس کی عمر میں اس دنیا فانی سے رخصت ہو گئے۔ موت سے تھوڑی دیر قبل وہ ٹیلی وژن دیکھ رہے تھے کہ اچانک انہیں اپنی گردن میں شدید درد محسوس ہوا اور اچانک ان کی سانس اکھڑ گئی۔ ان کی وفات پر فرانس کے صدر جارج پمپیڈو (Georges Pompedo) نے قوم سے اپنے نشریاتی خطاب میں صرف اتنا کہا۔ جنرل ڈیگال وفات پا گئے ہیں اور فرانس یتیم ہو گیا ہے۔ جنرل ڈیگال نے اپنی وفات سے پہلے وصیت کی تھی کہ ان کے جنازے میں حکومت کا کوئی وزیر یا صدر مملکت شرکت نہ کریں بلکہ صرف ان کے وہ ساتھی شریک ہوں جنہوں نے فرانس کی جنگ آزادی میں ان کا ساتھ دیا تھا مگر ان کی وصیت کے برعکس لاتعداد غیر ملکی شخصیات اور صدر فرانس سمیت حکومتی اکابرین کی بڑی تعداد نے ان کی تدفین کی رسومات میں شرکت کی جن میں امریکی صدر رچرڈ نکسن، روسی صدر نکولائی پڈگورنی، برطانوی وزیراعظم ایڈورڈ ہیتھ، ہندوستانی وزیراعظم اندرا گاندھی، اٹلی کے صدر، فرانس کے زیر تسلط سابق 117 ریاستوں کے سربراہان شامل تھے۔ چین کے عظیم لیڈر ماؤزے تنگ صحت کی خرابی کے باعث تدفین میں شریک نہ ہو سکے مگر انہوں نے بطور خاص جنرل ڈیگال کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے پھولوں کی چادر بھجوائی۔ ان کی رسومات میں جتنے افراد نے شرکت کی اس کی مثال فرانس کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

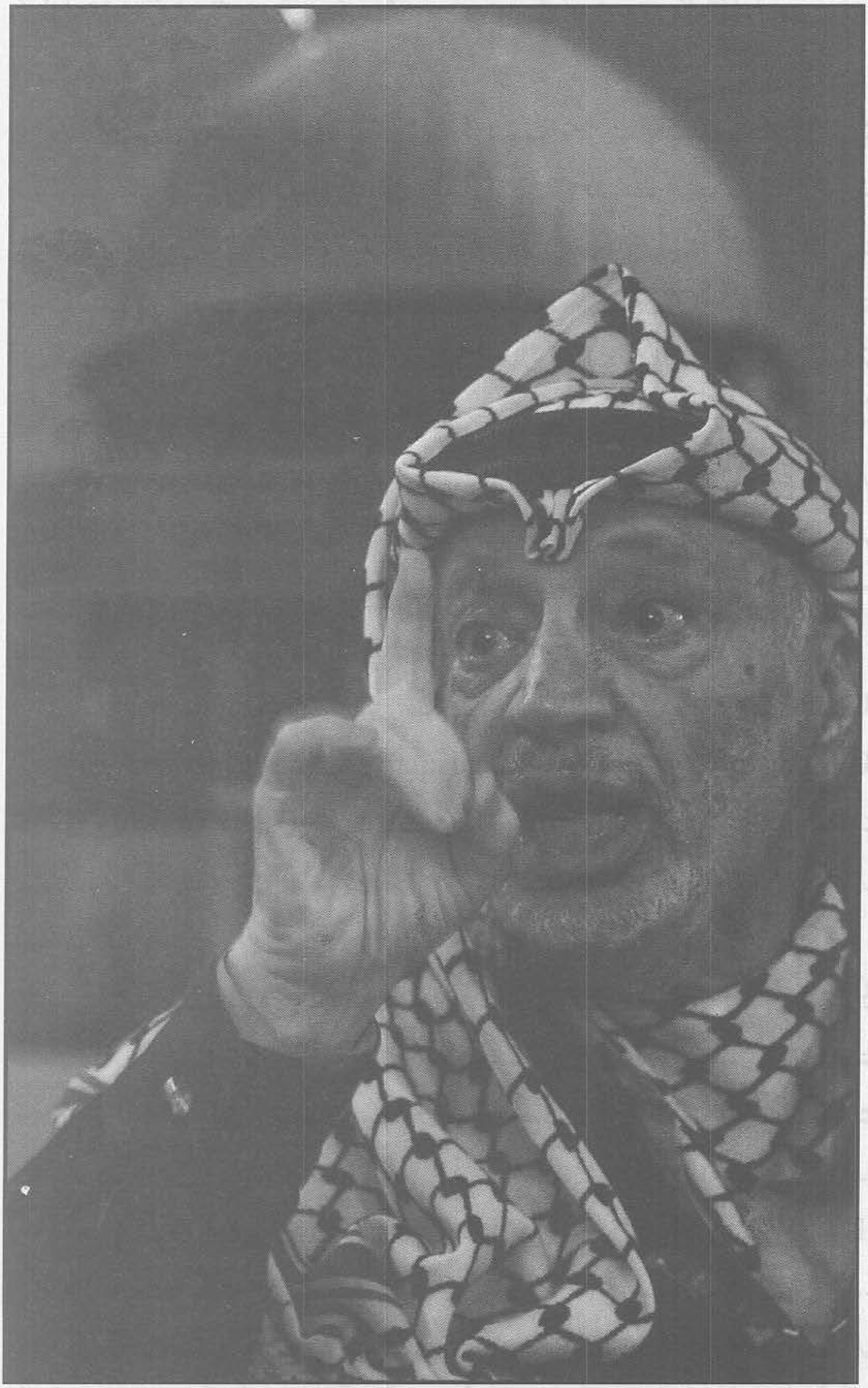
یاسر عرفات

YASSAR ARAFAT

فلسطین کی آزادی کے لئے زندگی کی آخری سانس تک جدوجہد کرنے والے عظیم انقلابی لیڈر یاسر عرفات کا اصل نام محمد یاسر عبدالرحمٰن عبدالرؤف عرفات ال قدوا ال حسینی تھا اور کنیت ابوعمار تھی۔

یاسر عرفات نے اپنی ساری زندگی اسرائیل کے خلاف جنگ کرنے میں گزاری۔ وہ فلسطین کی لبریشن آرگنائزیشن (PLO) کے چیئرمین اور سیاسی جماعت الفتح کے صدر رہے۔ یاسر عرفات کو اُن کی عظیم خدمات پر امن کا نوبل انعام بھی دیا گیا۔

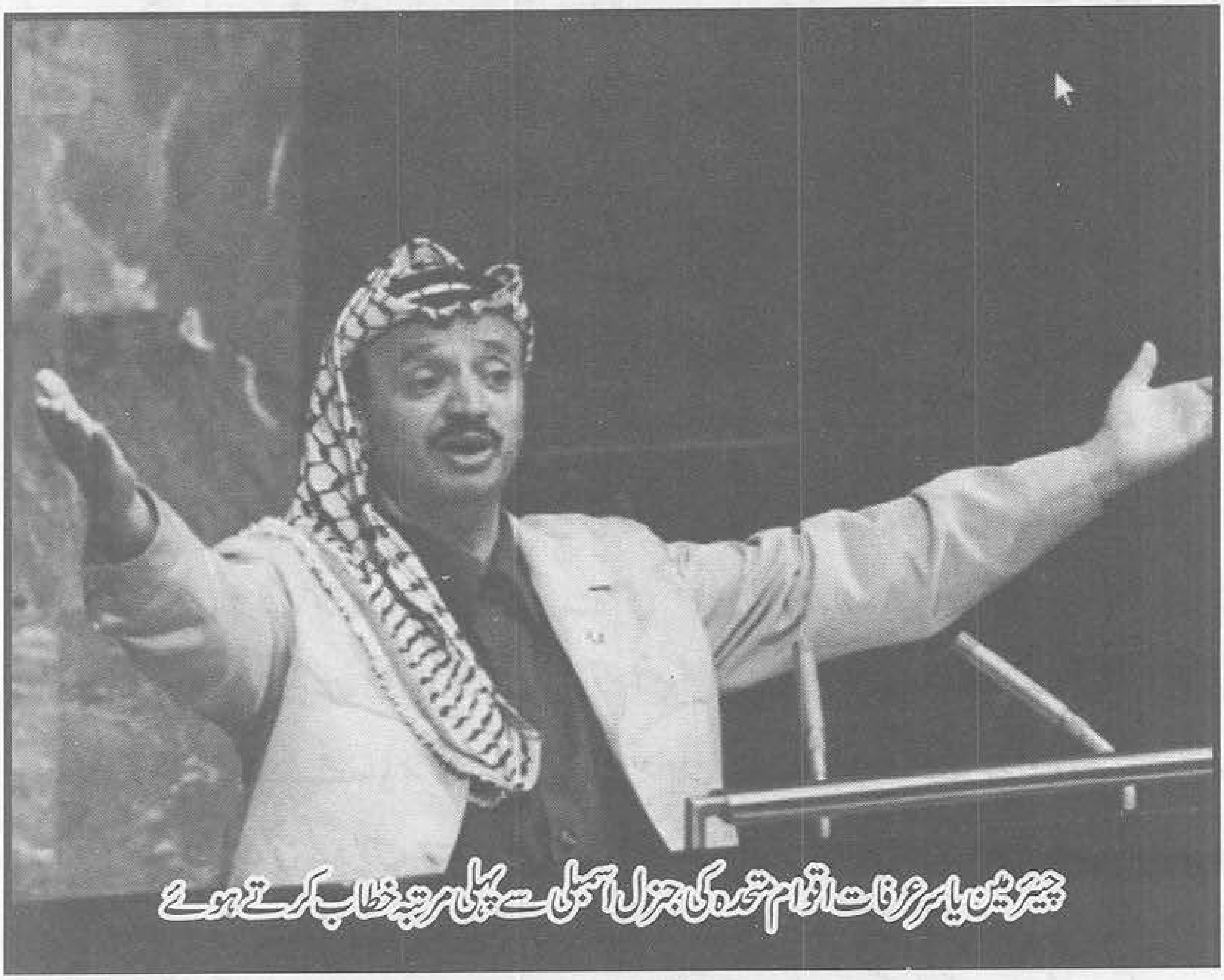
یاسر عرفات 24 اگست 1929ء کو مصر کے دارالحکومت قائرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبدالرؤف غاذا (Gaza) سے تعلق رکھنے والے فلسطینی تھے جو قائرہ میں کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ یاسر عرفات سات بہن بھائیوں میں سے چھٹے نمبر پر تھے۔ یاسر عرفات کی والدہ زاہوا (Zahwa) کا تعلق بیت المقدس سے تھا۔ یاسر عرفات کی عمر ابھی چار سال تھی جب اُن کی والدہ 1933ء میں بیماری کے باعث وفات پا گئی۔ یاسر عرفات کے والد نے غربت کے باعث یاسر اور اُن کے چھوٹے بھائی فاتحی کو بیت المقدس میں مقیم اُن کے ماموں سالم عبدالسعود کے پاس بھیج دیا جہاں وہ چار برس تک رہے 1937ء میں والد نے یاسر عرفات کو واپس مصر بلا لیا۔ 1952ء میں یاسر عرفات کے والد بھی انتقال کر گئے 1944ء کو یاسر عرفات نے یونیورسٹی آف کنگ فواد (قائرہ) میں داخلہ لیا اور 1950ء میں گریجوایشن کی ڈگری حاصل کی۔ یہاں انہیں بہت سارے یہودیوں کے ساتھ پڑھنے اور ان کے ساتھ بحث ومباحثہ کرنے کے باعث یہودیت اور یہودی ذہنیت کو سمجھنے



کا خاطر خواہ موقع ملا۔ اسی دوران وہ عرب قوم پرست بن گئے اور یہودیوں کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔

1948ء کی عرب اسرائیل جنگ میں یاسر عرفات نے دیگر عرب ساتھیوں کے ہمراہ حصہ لینے کے لئے فلسطین جانے کا فیصلہ کیا تاکہ وہاں وہ اسرائیلی فوجی دستوں کے خلاف لڑنے والے عرب دستوں کی مدد کرسکیں۔ تاہم 1949ء میں عربوں کو اسرائیل پر فتح حاصل نہ ہوسکی۔ 1952ء سے 1956ء تک یاسر عرفات نے جنرل یونین آف فلسطین اسٹوڈنٹس (GUPS) کے صدر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں۔ ان کی صدارت کے پہلے سال ہی یونیورسٹی کا نام تبدیل کر کے قائرہ یونیورسٹی رکھ دیا گیا۔ جب فری آفیسرز موومنٹ کی بغاوت کے نتیجہ میں شاہ فاروق کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ اُس وقت تک یاسر عرفات نے قائرہ یونیورسٹی سے انجینئرنگ کے شعبہ میں گریجوایشن کی ڈگری حاصل کر لی تھی مگر انہیں نہر سویز (SUEZ) کے تنازعہ پر ہونے والی جنگ میں مصری فوج کی مدد کے لئے ڈیوٹی پر بلا لیا گیا۔ فری آفیسرز موومنٹ کی قیادت کرنل جمال عبدالناصر کے پاس تھی جو شاہ فاروق کا تختہ الٹنے پر مصر کے سربراہ مملکت بن گئے تھے۔ 1956ء میں سویز بحران کے بعد مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے اقوام متحدہ کی ہنگامی فورس (United Nations Emergency Force) کو صحرائے سینا (Sinai Penisula) اور غزہ کی پٹی (Gaza Strip) میں اپنی عمل داری قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ اس کے ردعمل میں فلسطین کی آزادی کے لئے سرگرم عمل تمام گوریلا گروپوں اور فدائین میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ ان میں یاسر عرفات بھی شامل تھے۔

یاسر عرفات نے پہلے کینیڈا (Canada) اور بعد میں سعودی عرب کا ویزا حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے تاہم 1957ء میں سول انجینئرنگ میں بہترین خدمات کے باعث وہ کویت کا ویزا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کویت میں انہیں دو اہم شخصیات کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کا موقع مل گیا۔ اُن میں ایک صالح خالف عرف ابوایاد (Abu Iyad) اور دوسرے خلیل الویز عرف ابو جہاد (Abu Jihad) تھے دونوں (Egyptian Muslim Brotherhood) کے ممبران تھے۔ یہ دونوں مستقبل میں یاسر عرفات کے دست راست بن گئے۔ ابوایاد نے 1960ء میں یاسر عرفات کے ہمراہ کویت کا دورہ کیا۔ ابو جہاد 1959ء سے کویت میں بطور ٹیچر کام کر رہے تھے۔ کویت میں قیام پذیر ہونے پر ابوایاد نے یاسر عرفات کو بطور سکول ٹیچر کام



چیئرمین یاسر عرفات اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے پہلی مرتبہ خطاب کرتے ہوئے



چیئرمین یاسر عرفات مصر کے صدر حسنی مبارک سے مصافحہ کرتے ہوئے

کر رہے تھے۔ کویت میں قیام پذیر ہونے پر ابوایاد سے یاسر عرفات کو بطور سکول ٹیچر ملازمت دلوا دی۔ یاسر عرفات نے اس دوران یہاں مقیم دیگر فلسطینی مہاجرین کو بھی اپنے احباب میں شامل کر لیا جنہوں نے بعدازاں فتح گروپ (Fatah) کا نام اپنا لیا۔ الفتح کے قیام کی صحیح تاریخ کسی کو معلوم نہیں البتہ 1959ء میں ایک فلسطینی عوامی میگزین نے پہلی بار اس گروپ کی نشاندہی کی۔ الفتح دراصل The Palestinian National Liberation Movement کا مخفف تھا۔ الفتح کے پلیٹ فارم سے فلسطین کی آزادی کے لئے مسلح جدوجہد کرنے کا اعلان کیا گیا۔

یاسر عرفات فلسطینیوں کی الگ پہچان کی خاطر عرب ممالک کی چھتری کے نیچے آنے سے ہمیشہ گریز کیا اور عرب ممالک کی حکومتوں سے کسی قسم کی مالی امداد لینے سے انکار کیا تاکہ ان کی جماعت کی آزادانہ حیثیت برقرار رہ سکے۔ تاہم انہوں نے تمام عرب ممالک سے اپنے بہترین تعلقات ہمیشہ استوار رکھے۔ یاسر عرفات نے مالی تعاون کے لئے کویت، قطر اور خلیجی ریاستوں میں موجود فلسطینی کاروباری گروپوں سے رجوع کیا۔ قطر میں موجود محمود عباس (جو بعد میں فلسطین کے وزیراعظم اور صدر بنے) سے یاسر عرفات کے تعلقات 1961ء میں قائم ہوئے ان کاروباری حضرات اور تیل کی صنعت سے وابستہ ملازمین نے الفتح کے لئے دل کھول کر امداد فراہم کی۔ یاسر عرفات نے لیبیا (Libya) اور شام (Syria) میں مقیم دولت مند فلسطینیوں کا تعاون حاصل کر لیا۔ 1962ء میں یاسر عرفات نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شام میں سکونت اختیار کر لی۔ شام کی سرحدیں اسرائیل کے ساتھ ملتی ہیں اور ان دنوں شام اور مصر کے درمیان تعلقات انتہائی اچھے اور برادرانہ تھے۔ اس وقت تک الفتح کے باضابطہ ممبران کی تعداد 300 کے قریب تھی۔ شام میں قیام کے دوران یاسر عرفات نے ایسے جنگجو تیار کر لئے جو اسرائیل پر حملے کر سکیں۔ بعدازاں انہوں نے Palestine Liberation Army کے نام سے باقاعدہ فوج قائم کر لی۔ 1964ء میں عرب لیگ (Arab League) نے تنظیم آزادی فلسطین (Palestine Leberation Organization) کو باقاعدہ تسلیم کر لیا۔

31 دسمبر 1964ء کو الفتح کے مسلح ال آصفہ اسکواڈ نے اسرائیل میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن لبنان کی سکیورٹی فورس نے انہیں گرفتار کر لیا بعدازاں متعدد ایسی مسلح کارروائیاں کی گئیں جن میں کچھ کامیاب اور کچھ ناکام رہیں۔ ایسی مسلح کارروائیوں میں سے زیادہ تر کی قیادت خود یاسر عرفات نے کی۔ یاسر عرفات اور اُن کے دست راست ابو جہاد کو اُس وقت شام کی حکومت نے قید کر

دیا جب شام کے حامی فلسطینی لیڈر یوسف اورابی Yusuf Orabi قتل ہو گئے۔ اورابی شام کے صدر حافظ الاسد کے بہت قریبی دوست تھے اور شامی حکومت کو شک تھا کہ یاسر عرفات اورابی کے قتل میں ملوث ہیں۔ صدر حافظ الاسد نے اس قتل کی تحقیقات کے لئے جو ٹیم تشکیل دی انہوں نے یاسر عرفات اور ابو جہاد کو مجرم قرار دے دیا۔ تاہم صدر اسد نے انہیں معافی دے دی۔ 13 نومبر 1966ء کو اسرائیل نے اردن کے زیر انتظام مغربی کنارہ کے شہر As-Samu پر حملہ کر دیا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ الفتح کی طرف سے ایک بم حملہ میں اسرائیلی سکیورٹی فورس کے تین افسران ہلاک ہو گئے ہیں۔ اسرائیل اردن کے درمیان جھڑپوں میں اردنی سکیورٹی فورس کے متعدد لوگ بھی مارے گئے اور 125 گھر بھی مسمار ہو گئے۔ اسرائیل کی طرف سے یہ حملہ بعدازاں 1967ء کی چھ روزہ جنگ کی بنیاد بنا۔ یہ چھ روزہ جنگ اسرائیل کی طرف سے مصر پر فضائی حملہ سے شروع ہوئی اور اس جنگ کے نتیجہ میں اسرائیل نے عربوں کے متعدد علاقوں پر قبضہ کر لیا جن میں مغربی کنارہ اور غزہ کی پٹی بھی شامل تھی۔ اس جنگ میں اگرچہ عربوں کو شکست ہوئی مگر یاسر عرفات اور اُن کی جماعت الفتح کو ایک نیا عزم اور حوصلہ مل گیا۔ جنگ کے اختتام سے صرف ایک ہفتہ بعد یاسر عرفات نے انتہائی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے دریائے اردن عبور کر لیا اور اسرائیل کے زیر قبضہ مغربی کنارہ میں داخل ہو گئے جہاں انہوں نے خفیہ مقام پر رہتے ہوئے Hebron بیت المقدس Jerusuleim اور نابلوس (Noblus) میں فدائین کے لئے بھرتی کے مراکز قائم کر دیئے۔ اسی دوران مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے اپنے ایک مشیر محمد ہیکل کے ذریعے یاسر عرفات سے رابطہ قائم کیا اور یاسر عرفات کو فلسطینیوں کا لیڈر تسلیم کر لیا۔

1968ء کا تمام سال اسرائیلی فوج اردن کے ایک قصبہ کارامے Karameh میں فوجی آپریشن کرتی رہی۔ اس قصبہ میں الفتح کا ہیڈ کوارٹر ہونے کے علاوہ فلسطینی مہاجرین کا کیمپ بھی قائم تھا۔ اس قصبہ پر اسرائیلی فوج کشی کی وجہ یہ تھی کہ یہاں سے اسرائیلی ٹھکانوں پر الفتح کی جانب سے زبردست حملے کیے جاتے تھے۔

21 مارچ 1968ء کو اسرائیلی فوج نے بھرپور تیاری کے ساتھ "کارامے" پر زمینی اور فضائی حملہ کر دیا۔ الفتح کے جانثاروں نے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس جنگ میں یاسر عرفات کے بہت سارے ساتھی شہید ہو گئے مگر اسرائیلی فوجی بھی بڑی تعداد میں مارے گئے بالآخر اسرائیلی فوج کو پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ یاسر عرفات کی قیادت میں الفتح کے اس کارنامے نے یاسر عرفات کو دنیا بھر

میں ایک بڑے لیڈر کے طور پر متعارف کروا دیا اور دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ نے انہیں زبردست کوریج دی۔ عرب ممالک نے بھی یاسر عرفات کی جرأت، بہادری اور جنگی مہارت کو تسلیم کرلیا۔

3 فروری 1969ء کو قاہرہ میں منعقدہ فلسطینی نیشنل کونسل کے اجلاس میں یاسر عرفات کو Palestine Leberation Organization کا چیئرمین منتخب کرلیا گیا۔ انہیں فلسطینی انقلابی فورس کا کمانڈر انچیف بھی مقرر کر دیا گیا اور 1973ء میں یاسر عرفات PLO کے پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ بھی بن گئے۔ کارامے کی جنگ میں فتح کے باعث اردن میں یاسر عرفات کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوگیا۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے اردن کے شاہ حسین نے یاسر عرفات کو اردن کا وزیراعظم بننے کی دعوت دے دی مگر یاسر عرفات نے وزیراعظم بننے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اُن کی زندگی کا واحد مقصد آزاد فلسطینی ریاست کا قیام تھا اور اس مقصد کے لئے وہ اپنی جدوجہد جاری رکھنا چاہتے تھے۔ آئندہ ایام میں فلسطینی جنگجوؤں اور اردنی فوج کے درمیان بھی بعض معاملات پر جھڑپیں شروع ہوگئیں ادھر فلسطینی فدائین نے مختلف ملکوں کی ائرلائنوں کے جہاز اغوا کر کے اردن کے ہوائی اڈوں پر جبراً اتارنے شروع کر دیئے۔ مسافروں کو اتار کر طیارے جلا دیئے جاتے۔ اس صورت حال سے شاہ حسین پریشان ہو گئے اور جون 1971ء میں انہوں نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ وہ تمام فلسطینیوں کو اردن سے نکال باہر کریں۔ اردنی فوج نے فلسطینیوں کا خوب قتل عام کیا۔ یاسر عرفات اس فوجی کارروائی کے بعد اپنے ساتھیوں سمیت شام چلے گئے مگر شام کے صدر حافظ الاسد نے بھی یاسر عرفات اور ہزاروں دیگر فدائین کے لئے شام میں قیام ناممکن بنا دیا بالآخر فلسطینی جنگجو سرحد عبور کر کے لبنان میں داخل ہو گئے اور وہاں اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کرلیا۔ لبنان کی کمزور حکومت انہیں اپنی جنگی کارروائیاں جاری رکھنے سے نہ روک سکی۔ فلسطینی فدائین کو دنیا بھر میں اپنی آواز سنانے اور فلسطین کی آزادی کے لئے دیگر اقوام کی حمایت حاصل کرنے کے لئے انتہاپسندی کی راہ بھی اختیار کرنا پڑی۔ 1972ء میں میونخ میں منعقدہ اولمپک گیمز کے موقع پر فلسطینی فدائین نے اسرائیل کے گیارہ کھلاڑیوں کو اغوا کر کے قتل کر دیا۔ یہ خبر دنیا بھر میں جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ اس طرح کے متعدد واقعات میں فلسطینی فدائین نے اسرائیلیوں کو شدید جانی و مالی نقصان پہنچایا۔ جواب میں انہیں اسرائیلی ظلم و بربریت کا بھی سامنا کرنا پڑا اور ان گنت شہادتیں قبول کرنا پڑیں۔ 1973-74ء میں یاسر عرفات نے فدائین کو حکم دیا کہ وہ پرتشدد کارروائیوں کا حصہ نہ بنیں۔

1974ء میں فلسطینی نیشنل کونسل نے ایک دس نکاتی پروگرام کی منظوری دی جس کے نتیجہ میں

اسرائیل کے ساتھ ایک معاہدہ کر کے آزاد فلسطینی علاقے کا قیام عمل میں لانا تھا جو اُن علاقوں پر مشتمل ہونا تھا جو 1948ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل نے اپنے قبضہ میں لے لئے تھے یعنی مغربی کنارہ، مشرقی بیت المقدس اور غزہ کی پٹی۔ 1974ء میں عرب لیگ کی مراکش کے شہر رباط میں منعقدہ کانفرنس میں PLO کو فلسطین کے عوام کی واحد نمائندہ تنظیم تسلیم کر لیا گیا۔ اسی سال یاسر عرفات کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کی دعوت بھی دی گئی۔ یاسر عرفات نے اس خطاب میں کہا "میرے ایک ہاتھ میں امن کی علامت زیتون کی شاخ ہے اور دوسرے ہاتھ میں بندوق...... مجھے یقین ہے کہ دنیا میرے ہاتھ سے زیتون کی شاخ نہیں گرنے دے گی"۔

یاسر عرفات کے اس جذباتی خطاب سے دنیا میں ان کے لئے ہمدردی کے زبردست جذبات پیدا ہوئے۔ 1974ء میں پاکستان میں منعقد ہونے والی اسلامی سربراہی کانفرنس میں وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے یاسر عرفات کو فلسطین کے انقلابی لیڈر کے طور پر شرکت کا موقع دیا۔ پاکستان کے عوام نے یاسر عرفات کا زبردست استقبال کیا۔

یاسر عرفات کو بہت بڑا خطرہ سمجھتے ہوئے اسرائیلیوں نے انہیں قتل کرنے کی متعدد کوششیں کیں مگر ناکام رہے۔ یاسر عرفات اور اُن کے ساتھیوں کی خون سے رنگی ہوئی برس ہا برس کی جدوجہد بالآخر کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور 15 نومبر 1988ء کو تنظیم آزادی فلسطین (PLO) نے آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا۔ امریکہ کو بھی آخر فلسطینی ریاست کے وجود کو تسلیم کرنا پڑا اور اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل کی قرارداد نمبر 242 میں فلسطینی ریاست کے قیام کی منظوری دے دی گئی۔

2 اپریل 1989ء کو یاسر عرفات کو فلسطینی نیشنل کونسل اور PLO کی گورننگ باڈی نے فلسطینی ریاست کا صدر منتخب کر لیا۔

اسرائیل کو اگرچہ بین الاقوامی دباؤ کے تحت فلسطینی ریاست کے قیام کو تسلیم کرنا پڑا مگر فلسطینیوں کے خلاف اس کی جارحیت کبھی ختم نہیں ہوئی۔ یاسر عرفات اپنی زندگی کی آخری سانس تک اس جارحیت کا بھرپور مقابلہ کرتے رہے۔

24 جولائی 1995ء کو یاسر عرفات کی بیوی سوہا (Suha) نے ایک بیٹی کو جنم دیا جس کا نام یاسر عرفات نے اپنی مرحوم والدہ کے نام پر زاہوا Zahwa رکھا۔

1995ء میں یاسر عرفات نے اسرائیل کے قبضہ سے چھڑوائے گئے متعدد فلسطینی شہروں کا دورہ کیا۔

1996ء میں یاسر عرفات ایک بار پھر بر پورا اکثریت سے فلسطین کے صدر منتخب ہو گئے۔ 25 اکتوبر 2004ء کو یاسر عرفات بیمار ہو گئے۔ روز بروز اُن کی حالت بگڑتی چلی گئی انہیں علاج کے لئے فرانس لے جایا گیا مگر وہ سنبھل نہ سکے۔ 3 نومبر کو وہ قومہ میں چلے گئے اور 11 نومبر 2004ء کو 75 برس کی عمر میں وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

❋

فیڈل کاسترو

(FIDEL CASTRO)

ویسٹ انڈیز ریجن کے سب سے بڑے ملک کیوبا کے انقلابی لیڈر فیڈل کاسترو دنیا کے سرکردہ راہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں۔انہوں نے 1959ء میں کیوبا میں انقلابی برپا کرنے کے بعد عنان اقتدار سنبھالا اور 2008ء تک صدارت کے عہدہ سے خود الگ ہونے تک ان کی حکومت کو ختم کرنے کی ہر سازش برے طریقے سے ناکام ہوئی۔ فیڈل کاسترو سوویت یونین کے بانی لینن اور عظیم کمیونسٹ فلسفی کارک مارکس کے نظریات سے متاثر تھے اور اپنے ملک کیوبا کو انہوں نے کمیونسٹ ملک بنا دیا اور سوویت یونین کی طرز پر ہی کیوبا میں یک جماعتی نظام قائم کر کے تمام اختیارات کا منبع حکمران جماعت کمیونسٹ پارٹی کو بنا دیا۔ تمام صنعتوں اور زرعی زمینوں کو سرکاری تحویل میں لے لیا اور پورے ملک پر ہر لحاظ سے مکمل گرفت حاصل کر لی۔ فیڈل کاسترو 1959ء سے 1976ء تک جمہوریہ کیوبا کے وزیراعظم رہے۔ 1976ء میں وہ صدر مملکت بن گئے اور 2008ء تک بلا شرکت غیرے بطور صدر کیوبا کے سیاہ وسفید کے مالک رہے۔ کیوبا کی حکمران جماعت کمیونسٹ پارٹی جس کی بنیاد انہوں نے 1961ء میں رکھی کے فرسٹ سیکرٹری کی حیثیت سے انہوں نے 2011ء تک خدمات سرانجام دیں۔

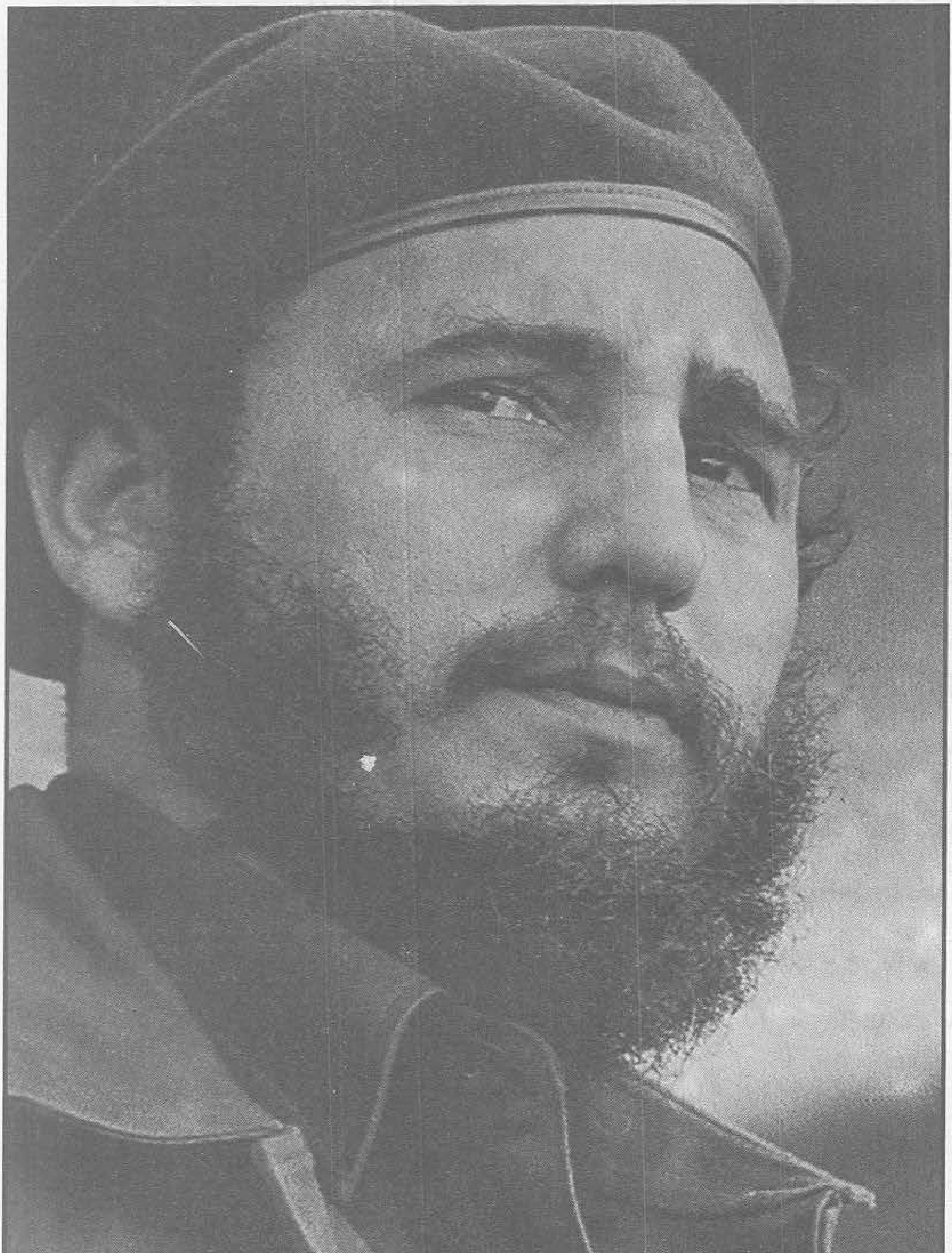
بین الاقوامی سطح پر کردار ادا کرتے ہوئے فیڈل کاسترو 1979ء سے 1983ء تک غیر جانبدار ممالک کی تنظیم کے سیکرٹری جنرل رہے اور ایک مرتبہ پھر 2006ء سے 2008ء تک اسی تنظیم کے سیکرٹری جنرل کے طور پر خدمات سرانجام دیں۔

فیڈل کاسترو جن کا مکمل نام فیڈل ایلیجاندرو کاسترض (Fidel Alejondro Castro

(Ruz تھا۔ Ruz اُن کی والدہ کا نام تھا جسے انہوں نے اپنی تمام زندگی اپنے نام کا حصہ بنایا۔ فیڈل کاسترو کے والد اینجل کاسترو شمال مغربی اسپین کے رہائشی تھے اور ایک معمولی کسان تھے۔ 1895ء کو وہ سپنش آرمی (Spanish Army) میں بھرتی ہو گئے۔ 1898ء میں امریکہ نے اسپین کے خلاف جنگ کا آغاز کر دیا جس کے نتیجہ میں انہوں نے کیوبہ کو ہسپانوی تسلط سے باہر نکال کر اپنی خودمختار حکومت بنانے کا موقع فراہم کر دیا اور 1902ء میں وہاں اپنی پسند کی حکومت قائم کروا دی۔ اس آزادی کے ثمرات سے فائدہ اٹھانے کے لئے اینجل کاسترو کیوبا منتقل ہو گئے اور یہاں انہوں نے مختلف کاروباری ذرائع سے خاطرخواہ دولت جمع کر لی۔ فیڈل کاسترو کی پیدائش 13/ اگست 1926ء کو ہوئی۔ اُن کی والدہ لینا رُض (Lina Ruz) نے فیڈل کے علاوہ دو بیٹوں اور تین بیٹیوں کو جنم دیا۔ فیڈل اپنے بہن بھائیوں میں تیسرے نمبر پر تھے۔؛

چھ برس کی عمر میں فیڈل کاسترو کو عیسائیت کی تعلیم دلوانے کے لئے ایک ٹیچر کے ہاں سینٹا گودی کیوبا (Santiagoode Cuba) بھیج دیا گیا۔ آٹھ سال کی عمر میں انہیں ایک رومن کیتھولک چرچ میں داخل کروا دیا گیا مگر فیڈرل کاسترو عیسائیت سے زیادہ متاثر نہ ہو سکے اور مذہب کے ساتھ بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے دہریا (Atteist) بن گئے۔ بعدازاں مختلف تعلیمی اداروں سے انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کی۔

1945ء میں فیڈرل کاسترو نے ویانا یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے داخلہ لے لیا۔ یونیورسٹی میں ان دنوں حکومت کے خلاف مظاہروں میں اسٹوڈنٹس یونین نمایاں کردار ادا کر رہی تھی۔ فیڈل کاسترو اپنے مزاج کے مطابق یونیورسٹی کی سیاست میں سرگرم ہو گئے۔ انہوں نے بائیں بازو کی متحرک طلباء تنظیموں پاپولر سوشلسٹ پارٹی، سوشلسٹ ایولوشنری موومنٹ اور ریوکیوشنری یونین سے زبردست روابط قائم کر لئے۔ نومبر 1946ء میں فیڈل کاسترو نے حکومت کی کرپشن اور بدعنوانی کے خلاف ایک زوردار تقریر کی جو اگلے روز کیوبا کے تمام اہم اخبارات میں نمایاں طور پر شائع ہوئی جس نے انہیں پورے ملک میں متعارف کروا دیا۔ 1947ء میں فیڈل کاسترو نے ایک نئی سوشلسٹ جماعت ''پارٹی آف دی کیوبن پیپل'' (Party of the Cuban People) میں باقاعدہ شمولیت اختیار کر لی۔ یہ پارٹی کیوبا کے انتہائی مقبول کمونسٹ لیڈر ایڈورڈو شیبا (Eduardo Chiba's) نے قائم کی تھی جو کہ سماجی انصاف، دیانتدار حکومت کے قیام اور سیاسی آزادیوں کے زبردست داعی تھے۔ اگرچہ Chiba's کبھی حکومت بنانے میں کامیاب نہ



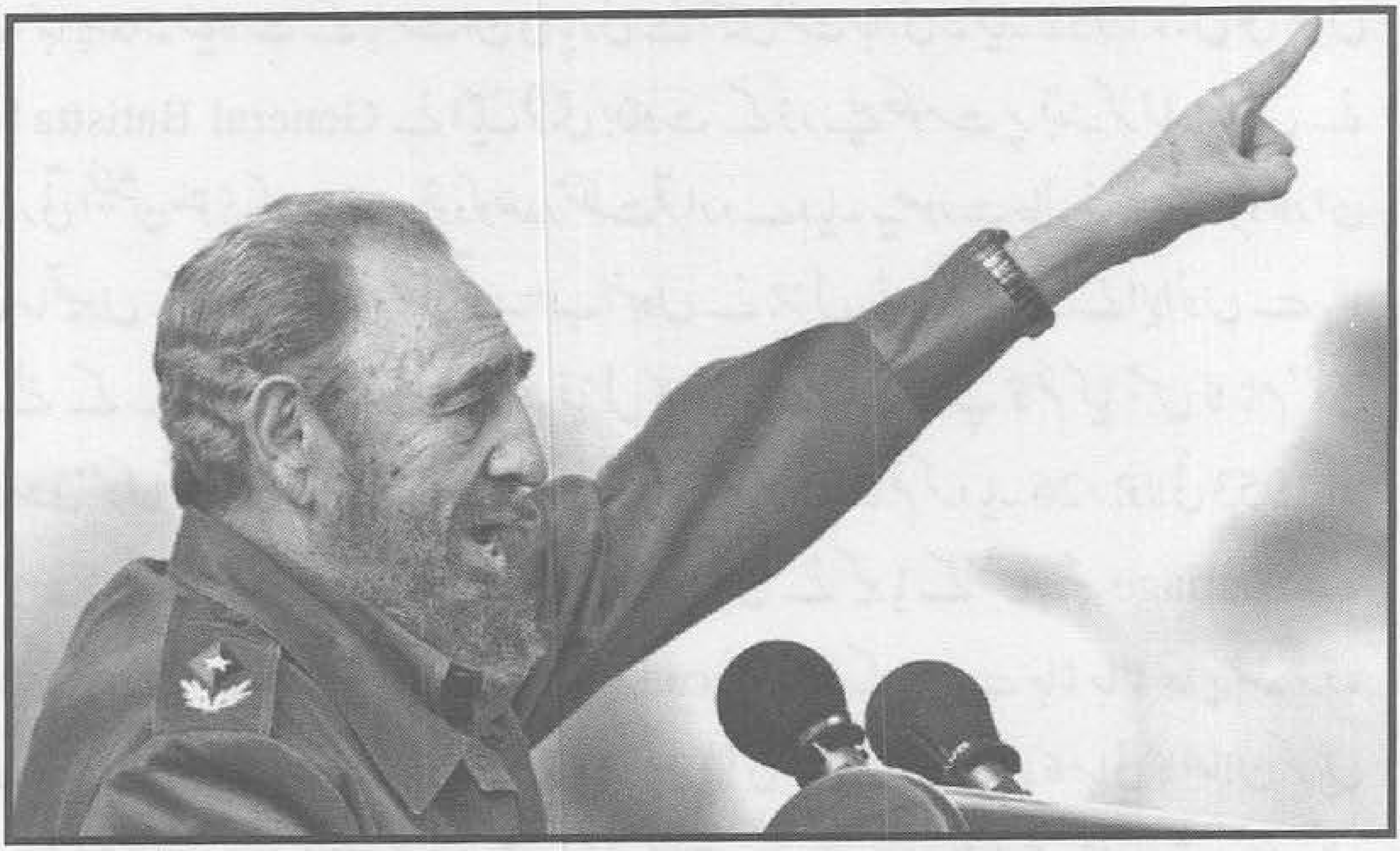
ہوئے مگر فیڈل کاسترو نے زندگی بھر انہیں اپنا لیڈر مانا اور اُن کے نظریات کی بنیاد پر اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ 1948ء میں کیوبا کی حکومت نے بسوں کے کرایوں میں اضافہ کر دیا۔ ان دنوں طالب علموں کے لئے آمدورفت کا ذریعہ صرف بسیں تھیں۔ کرایوں میں اضافہ کے باعث طالبعلم سخت مالی مشکلات کا شکار ہو گئے اور انہوں نے حکومت کے خلاف شدید احتجاج شروع کر دیا۔ فیڈل کاسترو نے اس احتجاج کو بلندیوں پر پہنچا دیا اور طالبعلموں کی مؤثر آواز بن کر وہ ملک بھر میں شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگے۔

1948ء میں ہی فیڈل کاسترو نے یونیورسٹی کی ایک طالبہ (Mirta Diaz Balart) سے شادی کر لی۔ یہ دونوں کی پسند کی شادی تھی مگر دونوں کے خاندان اس شادی کے حق میں نہ تھے۔ Mirta کے والد بہت امیر آدمی تھے تاہم انہوں نے کچھ عرصہ بعد اس شادی کو قبول کر لیا اور اپنی بیٹی کو بہت ساری دولت سے نواز دیا جس سے فیڈل کاسترو کو بھی اپنی سیاسی سرگرمیاں جاری رکھنے میں بڑی مدد ملی۔ 1950ء میں ڈاکٹر آف لاء کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد فیڈل کاسترو نے قانون کے پروفیسر کے طور پر ملازمت اختیار کر لی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے سوشلسٹ ساتھیوں کے ساتھ مل کر لیگل پریکٹس شروع کر دی جس کا مقصد کیوبا کے غریب عوام کو ان کے جائز حقوق دلوانے میں ان کی مدد کرنا تھا۔ مالی طور پر فیڈل کاسترو اور ان کے ساتھیوں کو لیگل پریکٹس سے زیادہ فائدہ نہ ہوا۔ ستمبر 1949ء کو اُن کے ہاں ایک بیٹے کی پیدائش ہوئی جس کا نام Fidelito رکھا گیا۔

نومبر 1950ء میں کیوبا کی وزارت تعلیم نے طلباء سیاست پر پابندی عائد کر دی جس پر احتجاج کے دوران پولیس اور طلباء کے درمیان چار گھنٹے تک لڑائی ہوئی جس میں بہت سے طالبعلم زخمی ہوئے۔ فیڈل کاسترو نے طلباء کا بھرپور ساتھ دیا جس پر فیڈل کاسترو کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر الزام عائد کیا گیا کہ انہوں نے طلباء کو پولیس پر حملہ آور ہونے پر اکسایا ہے۔ عدالت نے الزام ثابت نہ ہونے پر انہیں رہا کر دیا۔

1951ء کے انتخابات میں صدارتی امیدوار اور فیڈل کاسترو کے محبوب لیڈر Chiba's نے انتخابی مہم کے دوران حکومت کی ناانصافیوں کے خلاف خود کو گولی مار لی۔ فیڈل کاسترو اس موقع پر موجود تھے۔ Chiba's ہسپتال پہنچ کر دم توڑ گئے۔ اس واقعہ نے کاسترو کو حکومت کے خلاف اپنی جدوجہد مزید تیز کرنے پر اکسایا۔

جون 1952ء میں انہوں نے کانگرس کی رکنیت کے لئے الیکشن لڑنے کی خواہش کی مگر ان





فیڈل کاسترو عظیم انقلابی لیڈر چے گویرا کے ساتھ

کے انتہا پسندانہ خیالات کے باعث ان کی پارٹی نے انہیں ٹکٹ جاری نہ کیا۔ 1952ء میں ہی جنرل باٹسٹا General Batistta نے ایک فوجی بغاوت کے ذریعے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے صدارتی الیکشن ملتوی کر دیئے اور خود کو صدر مملکت قرار دے دیا۔ یہ صورت حال فیڈل کاسترو اور ان کے ساتھیوں کے لئے ناقابل قبول تھی۔ اب انہوں نے جنرل باٹسٹا کو اقتدار کے ایوانوں سے بالا نکالنے کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ فیڈل کاسترو نے ایک گروپ قائم کیا جس کا نام ''دی موومنٹ'' رکھا گیا اور سول کے علاوہ اس کا ایک ملٹری ونگ بھی قائم کر دیا۔ 26/جولائی 1953ء کو فیڈل کاسترو کے ملٹری ونگ کے 165 اسلحہ بردار ممبران نے کیوبا کے مشہور شہر Santiage کے ملٹری گریزن جو مونکاڈا بیریکس (Moncada Baracks) کے نام سے جانا جاتا تھا پر حملہ کر دیا اُن کا ارادہ تھا کہ وہ Santiage کے ریڈیو اسٹیشن پر بھی قبضہ کریں گیا اور کامیابی کا اعلان کریں گے۔ 165 انقلابیوں کے اس گروپ میں فیڈل کاسترو کے علاوہ تمام افراد غیر شادی شدہ تھے۔ مگر سکیورٹی گارڈز کی طرف خطرہ کے الارم چلا دینے کے باعث یہ حملہ ناکام ہو گیا۔ اس حملہ میں سرکاری فوج کے 19 افراد مارے گئے جبکہ کاسترو کے ساتھیوں میں سے 21 افراد لقمہ اجل بن گئے۔ کاسترو کے کچھ ساتھیوں نے ایک سول ہسپتال پر بھی قبضہ کر لیا تھا مگر سرکاری فوج نے حملہ کر کے کچھ افراد کو موقع پر ہی ہلاک کر دیا اور باقیوں کو گرفتار کر لیا بعد میں فوجی عدالت میں مقدمہ چلا کر 22 افراد کو پھانسی کے پھندا پر لٹکا دیا گیا۔ جو باغی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اُن میں فیڈل کاسترو کے علاوہ ان کے بھائی رول (Raul) بھی تھے۔ مونکاڈ بیریکس پر حملہ کے جواب میں حکومت نے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا اور باغیوں کے خلاف سخت کارروائیاں شروع کر دیں۔ چند روز بعد حکومت نے فیڈل کاسترو سمیت تمام باغیوں کو گرفتار کر لیا۔ بعد میں فیڈل کاسترو کے سوا تمام باغیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ فیڈل کاسترو کو شک کا فائدہ دیا گیا کہ وہ حملہ میں براہ راست ملوث نہیں تھے۔ 21/ستمبر 1953ء کو فیڈل کاسترو پر مقدمہ چلایا گیا جو 15/اکتوبر تک مکمل ہو گیا۔ فیڈل کاسترو کو 15/سال قید کی سزا دی گئی۔

فیڈل کاسترو نے جیل میں بھی اپنی توجہ سیاسی امور پر مبذول رکھی اور جیل سے باہر اپنے ساتھیوں کو انقلاب کے لئے تیار کرتے رہے۔ جیل میں انہوں نے قیدیوں کو پڑھانا بھی شروع کر دیا۔ وہ روزانہ پانچ گھنٹے تدریسی عمل پر صرف کرتے اور جیل کی لائبریری سے بھرپور استفادہ کرتے۔ فیڈل کاسترو کی گرفتاری کے دوران حالات سے تنگ آ کر اُن کی بیوی Mirta نے وزارت

داخلہ میں ملازمت اختیار کر لی مگر کاسترو کو اس کی خبر نہ ہونے دی۔ جونہی فیڈل کاسترو کو اس بارے میں اطلاع ملی تو انہوں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ 1954ء میں جنرل باٹسٹا نے ملک میں صدارتی انتخابات کا اعلان کر دیا۔ فیڈل کاسترو تو جیل میں تھے مگر دیگر سیاستدانوں میں سے کسی نے جنرل باٹسٹا کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہ کی اور وہ آسانی کے ساتھ صدارتی انتخاب جیت گئے۔ الیکشن میں کامیابی پر صدر باٹسٹا کے ساتھیوں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ ملک میں اچھی سیاسی فضا قائم کرنے کے لئے خیر سگالی کے جذبہ کے تحت فیڈل کاسترو سمیت تمام سیاسی قیدیوں کے لئے عام معافی کا اعلان کر دیں۔ صدر باٹسٹا نے اس مشورہ کو قبول کرتے ہوئے 15 رمئی 1955ء کو تمام سیاسی قیدیوں کی رہائی کا اعلان کر دیا۔

1955ء کے اوائل میں صدر باٹسٹا کی حکومت کے خلاف شدید ہنگامے شروع ہو گئے اور متعدد مقامات پر بم دھماکے بھی ہوئے۔ فیڈل کاسترو کے بھائی Raul کو ایک بم دھماکے کا مجرم قرار دے دیا گیا جس پر انہیں کیوبا سے فرار ہو کر پڑوسی ملک میں پناہ لینا پڑی۔ 7رجولائی 1955ء کو فیڈل کاسترو نے خود بھی جلاوطنی اختیار کر لی مگر اُن کے لاتعداد انقلابی ساتھی کیوبا میں ہی مقیم رہے اور فیڈل کاسترو کی ہدایات کے مطابق حکومت مخالف سرگرمیاں جاری رکھیں۔ فیڈل کاسترو ان کے بھائی اور ان کے متعدد ساتھیوں کو میکسیکو (Mexico) کی حکومت نے سیاسی پناہ دے دی۔ میکسیکو میں قیام کے دوران فیڈل کاسترو کی ملاقات ارجنٹائن (Argentine) سے تعلق رکھنے والے ایک مارکسنٹ لیننسٹ (Lennist) لیڈر اور گوریلا جنگ کے ماہر شے گولرا (Che-Guelra) سے ہوئی جو بعدازاں زبردست دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ شے گویرا امریکی امپریل ازم (Imperialism) کے سخت مخالف تھے۔ فیڈل کاسترو کے بھائی رول کاسترو نے بھی بڑی تعداد میں انقلاب پسندوں کو کیوبا کے فاشسٹ جنرل باٹسٹا کی حکومت کا تختہ الٹنے پر آمادہ کر لیا۔ ادھر فیڈل کاسترو نے اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لئے فنڈز جمع کرنے کی مہم شروع کر دی۔ انہوں نے امریکہ کا دورہ کیا اور انقلاب کے حامی اور کیوبا کے عوام کے ہمدرد امیر لوگوں سے چندہ اکٹھا کیا۔ دیگر متعدد امیر لوگوں کے علاوہ امریکہ میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے والے کیوبا کے سابق صدر پری او (Prio) نے ایک لاکھ ڈالر کی خطیر رقم بھی فیڈل کاسترو کو پیش کی۔ کاسترو نے اس رقم سے ایک بڑی کشتی (Yacht) اور کچھ اسلحہ خریدا اور 25 نومبر 1956ء کو اس کشتی پر سوار اپنے 81 انقلابی ساتھیوں کے ہمراہ کیوبا کے لئے روانہ ہو گئے۔ ان ساتھیوں کے پاس 90 رائفلیں، تین مشین گنیں، 40 پستول اور چند ٹینک

شکن گنیں تھیں۔ ان کی کشتی 2/دسمبر 1956ء کو کیوبا کے ایک ساحل پر لنگر انداز ہوئی۔ فیڈل کاسترو اور ان کے ساتھیوں نے Scerra Maestra کے جنگل کو اپنی پناہ گاہ بنایا اور کیوبن حکومت کے خلاف گوریلا جنگ شروع کر دی۔ پہلے مرحلہ پر وہ فوجی بیرکوں پر منظّم حملے کرتے اور وہاں سے اسلحہ چھین لیتے۔ گوریلا کارروائیوں نے صدر باٹسٹا کو حواس باختہ کر دیا اور 31/دسمبر 1958ء کو باٹسٹا نے استعفیٰ دے دیا اور اقتدار فوج کے حوالے کر کے اپنے خاندان اور اہم ساتھیوں سمیت ملک سے فرار ہو گئے۔ یکم جنوری 1959ء کو جنرل بائسٹا کی حکومت کے خاتمہ کی خبر پورے کیوبا میں پھیل گئی۔ 2/جنوری کو شے گویرا کی قیادت میں انقلابی دستے دارالحکومت ہوانا (Havana) میں داخل ہو گئے اس طرح فیڈل کاسترو کیوبا کے سیاہ وسفید کے مالک بن گئے۔ 1961ء میں فیڈل کاسترو نے کیوبا کو سوشلسٹ ملک قرار دے دیا۔ امریکہ کیوبا کے سوشلسٹ بلاک میں چلے جانے سے فیڈل کاسترو کا سخت مخالف ہو گیا اور یہ مخالفت کبھی ختم نہ ہو سکی۔ امریکہ نے فیڈل کاسترو کی حکومت کو گرانے کے لئے ہر ممکن اقدامات کئے مگر اُسے کامیابی نہ مل سکی۔ 21/جولائی 2006ء کو اپنی 80ویں سالگرہ کے موقع قوم سے خطاب کرتے ہوئے فیڈل کاسترو نے کہا: ''میں خوش ہوں کہ میں 80 سال کی عمر میں پہنچ گیا ہوں۔ میں نے کبھی اس کی توقع نہیں کی تھی خاص طور پر دنیا کی سب سے بڑی طاقت کہلانے والے ایک پڑوسی ملک کے ہوتے ہوئے جس نے ہر روز مجھے قتل کرنے کی کوشش کی''۔

24/فروری 2008ء کو فیڈل کاسترو نے قومی اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے اپنی صدارت اور مسلح افواج کے کمانڈر انچیف کے عہدہ سے مستعفی ہونے کا اعلان کر دیا۔ اسی روز قومی اسمبلی نے متفقہ طور پر ان کے بھائی اور طویل جدوجہد کے بااعتماد ساتھی رول کاسترو کو نیا صدر اور افواج کا کمانڈر انچیف منتخب کر لیا۔ صدارت سے الگ ہونے کے بعد فیڈل کاسترو کیوبا کے کثیر الاشاعت اور قومی اخبار گراما (Granma) میں باقاعدگی کے ساتھ کالم لکھتے ہیں۔ 7/اگست 2010ء کو فیڈل کاسترو نے کیوبا کی قومی اسمبلی سے خطاب کیا۔ اُن کی تقریر 10 منٹ سے زیادہ جاری نہ رہ سکی۔

19/اپریل 2011ء کو فیڈل کاسترو نے کمیونسٹ پارٹی کی سینٹرل کمیٹی سے بھی استعفیٰ دے دیا۔ اس طرح عملاً وہ سیاست سے بھی کنارہ کش ہو گئے۔

کوامے نکرومہ

KWAME NKRUMAH

پہلے آزاد افریقی ملک گھانا کی آزادی کے ہیرو اور ریپبلک آف گھانا کے پہلے صدر

گھانا افریقہ کا وہ پہلا ملک ہے جسے برطانوی سامراج سے آزاد کروانے کا اعزاز نکرومہ کو حاصل ہے۔ ریپبلک آف گھانا (Republic of Ghana) مغربی افریقہ میں واقع ہے جس کے مغرب میں Ivory Coast، شمال میں Burking Faso، مشرق میں Togo اور جنوب میں Gulf of Guinea کے ممالک ہیں۔ گھانا کا لفظی معنی ''جنگجو بادشاہ'' ہے۔ برطانیہ نے 1874ء میں اس سرزمین پر قبضہ کیا تھا اور اس کا نام گولڈ کوسٹ Gold Coast رکھ دیا تھا۔ گھانا کی آزادی نے برطانوی اور فرانسیسی سامراج کے زیر تسلط دیگر افریقی ممالک میں بھی آزادی کی تحریکوں کو جنم دیا جس کے نتیجہ میں متعدد افریقی ممالک غلامی کی زنجیریں توڑنے میں کامیاب ہو گئے۔

نکرومہ افریقی ممالک کے اتحاد اور ترقی کے بہت بڑے علمبردار کے طور پر دنیا بھر میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ وہ مصر کے صدر جمال عبدالناصر کے بعد آرگنائزیشن آف یونٹی کے چیئرمین بھی رہے۔ نکرومہ دنیا کے وہ واحد لیڈر ہیں جو امریکی سی آئی اے کے ہاتھوں اپنی حکومت کے خاتمہ کے بعد جب جلاوطن ہوئے تو ایک دوسرے افریکی ملک گنی Guinea کے صدر احمد سکوطورے (Ahmed Sekoutoure) نے انہیں اپنے ملک کا شریک صدر بنا دیا۔

نکرومہ افریقی دنیا کے انتہائی پڑھے لکھے اور ذہین لیڈر تھے۔ نکرومہ 1909ء میں نکروفل Nkroful گولڈ کوسٹ میں پیدا ہوئے۔ 1930ء میں انہوں نے گریجوایشن کرنے کے بعد ایک

رومن کیتھولک سکول میں بطور ٹیچر ملازمت اختیار کر لی۔ 1935ء میں نکرومہ مزید تعلیم کے لئے امریکہ چلے گئے جہاں انہوں نے 1939ء میں Lincoln University Pennsy Anania سے ڈگری حاصل کی اور ایک دوسرے تعلیمی ادارے سے Bachelor of Sacred Theology کی ڈگری حاصل کی۔ 1942ء میں نکرومہ نے Crninesity of Pennsylvania سے سائنس ان ایجوکیشن میں ایم اے کیا اور 1943ء میں فلاسفی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم کے بعد وہ Lincoln یونیورسٹی میں بطور لیکچرر خدمات سرانجام دینے لگے۔ اسی دوران نکرومہ امریکہ اور کینڈا کی اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے صدر منتخب ہو گئے۔ امریکہ میں اپنے قیام کے دوران وہ فلیڈلفیا اور نیو یارک شہر کے مختلف گرجا گھروں میں تعلیم بھی دیتے رہے۔ امریکہ میں قیام کے دوران ہی نکرومہ کے تعلقات ایسے دانشوروں سے استوار ہو گئے جو کارل مارکس کے نظریات سے بہت متاثر تھے اور جنہوں نے نکرومہ کو بھی کمیونسٹ نظریات کا حامل بنا دیا۔

مئی 1945ء میں نکرومہ لندن چلے گئے جہاں انہوں نے لنڈن اسکول آف اکنامکس میں داخلہ لے لیا۔ یہاں اُن کی دوستی ایک انقلابی دانشور جارج پیڈمور George Padmore سے ہو گئی جن کی مدد سے نکرومہ نے مانچسٹر سٹی میں پانچویں پین افریقن کانگرس Fifth Pan-:African Congress منعقد کی۔ بعدازاں انہوں نے ویسٹ نیشنل سیکرٹریٹ کی بنیاد رکھی اور افریقہ سے نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ کے لئے کام کرنا شروع کر دیا۔ نکرومہ خود اس تنظیم کے نائب صدر بنے۔

دسمبر 1947ء میں نکرومہ واپس اپنے ملک چلے گئے جہاں انہیں یونائیٹڈ گولڈ کوسٹ کنونشن کا جنرل سیکرٹری بننے کی پیشکش کی گئی جو انہوں نے قبول کر لی۔ یونائیٹڈ کنونشن اپنے ملک کی آزادی کے لیے کام کر رہا تھا۔

فروری 1948ء میں افریقن ایکس سروس مین (African Ex Sevicwe Men نے روز بروز بڑھتی ہوئی مہنگائی کے خلاف جلوس نکالا تو پولیس نے ان پر فائرنگ کر دی جس کے ردعمل کے طور پر ملک کے متعدد شہروں میں ہنگامے پھوٹ پڑے۔ انگریز حکومت نے سمجھا کہ ان ہنگاموں کے پیچھے یونائیٹڈ گولڈ کوسٹ کنونشن کا ہاتھ ہے لہٰذا نکرومہ سمیت کنونشن کے اہم لیڈروں اور کارکنوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ نوآبادیاتی حکومت کی طرف سے نکرومہ کی گرفتاری نے انہیں ملک بھر میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا اور 1948ء کی یوتھ موومنٹ کے وہ سرکردہ لیڈر بن گئے۔ بعدازاں نکرومہ نے



ملک بھر کے دورے کئے اور اعلان کیا کہ ملک کو خودمختار حکومت کی ضرورت ہے جس پر انہیں عوام کی بھرپور حمایت حاصل ہوگئی اور وہ برطانوی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ نکرومہ نے بطور خاص خواتین پر زور دیا کہ وہ بھی ملک کی آزادی کے لئے مردوں کے شانہ بشانہ جدوجہد کریں۔ ٹریڈ یونینوں نے بھی نکرومہ کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا۔ 1949ء میں نکرومہ نے باقاعدہ ایک سیاسی جماعت بنانے کا اعلان کر دیا جس کا نام کنونشن پیپلز پارٹی رکھا گیا۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے برطانوی حکومت نے گولڈ کوسٹ میں نسبتاً زیادہ خودمختار حکومت قائم کرنے کے لئے نیا آئین متعارف کروایا جس کی رو سے عوام کو ووٹ دینے کا حق دیا گیا مگر یہ حق صرف ان لوگوں کو دیا گیا جو یا تو اچھی تنخواہ لیتے ہوں یا کسی جائیداد کے مالک ہوں۔ غریب عوام کو ووٹ کے حق سے محروم رکھا گیا۔ نکرومہ نے اس آئین کو مسترد کر دیا اور کنونشن پیپلز پارٹی کے زیر اہتمام ایک پیپلز اسمبلی کا اجلاس منعقد کیا جس میں مزدوروں، کسانوں، ٹریڈ یونینوں کے نمائندوں وغیرہ کو جمع کیا گیا۔ پیپلز اسمبلی نے برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا کہ تمام عوام کو بغیر کسی تفریق کے ووٹ دینے کا حق دیا جائے۔ اکتوبر 1949ء کو نکرومہ نے اپنی پارٹی کے ذریعے حکومت کو آئین میں ترامیم کی باضابطہ تجاویز دیں۔ برطانوی حکمرانوں نے ان تجاویز کو یکسر مسترد کر دیا جس کے جواب میں نکرومہ نے جنوری 1950ء میں پازیٹو ایکشن (Positive Action) کے نام حکومت کے ساتھ عدم سے تعاون، بائیکاٹ اور سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی جس پر حکومت نے نکرومہ اور اُن کے تمام ساتھیوں کو گرفتار کر لیا۔ نکرومہ کو تین سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ نکرومہ اور ان کے ساتھیوں کی گرفتاری سے حالات مزید خراب ہو گئے اور پورا ملک افراتفری کی نذر ہو گیا۔ ادھر دنیا کے دیگر ممالک نے بھی برطانوی حکومت کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا اور گرفتار سیاسی قیدیوں کی رہائی کے علاوہ گولڈ کوسٹ کی آزادی کو بھی وقت کی اہم ضرورت قرار دیا۔

برطانوی حکومت نے مجبور ہو کر بالآخر گولڈ کوسٹ سے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا اس مقصد کے لئے 5 سے 10 فروری 1951ء کے دوران حق بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عام انتخابات کا انعقاد کیا نکرومہ اور ان کے ساتھی جیل میں ہوتے ہوئے بھی بڑی تعداد میں انتخابات جیت گئے۔ نکرومہ کی جماعت کنونشن پیپلز پارٹی نے قانون ساز اسمبلی کی 38 میں سے 34 سیٹیں جیت لیں۔ 12 فروری 1951ء کو نکرومہ کو رہا کر دیا گیا اور برطانوی گورنر چارلس ایڈن کلارک نے انہیں ملاقات کی دعوت دی اور حکومت بنانے کا کہہ دیا۔



صدر نکرومہ ایک تقریب کے دوران



کوامے نکرومہ امریکہ کے انقلابی لیڈر مارٹن لوتھر کنگ کے ہمراہ

20 فروری 1951ء کو قانون ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا اور نکرومہ کو لیڈر آف دی ہاؤس چن لیا گیا۔ 10 مارچ 1952ء کو آئین میں ایک ترمیم کے ذریعے وزیراعظم کا عہدہ تخلیق کیا گیا اور 21 مارچ کو قانون ساز اسمبلی نے بھاری اکثریت سے نکرومہ کو ملک کا وزیراعظم منتخب کر لیا نکرومہ نے قانون ساز اسمبلی میں ایک قرارداد پیش کی کہ دولت مشترکہ کے اندر رہتے ہوئے ملک کی آزادی کا اعلان کر دیا جائے۔ یہ قرارداد 10 جولائی 1953ء کو منظور کر لی گئی۔ تاہم نکرومہ نے 6 مارچ 1957ء کو ملک کا نام گولڈ کوسٹ سے تبدیل کر کے گھانا رکھ دیا اور آزاد مملکت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ نکرومہ کو قوم نے ''نجات دہندہ'' کا لقب دے کر زبردست خراج تحسین پیش کیا۔

6 مارچ 1960ء کو انہوں نے ایک نیا آئین بنانے کی تجویز پیش کی جس کا مقصد گھانا کو ایک ''ریپبلک'' (Republic) بنانا تھا۔

19، 23 اور 27 اپریل 1960ء کو صدارتی انتخابات اور نئے آئین کی منظوری کے لئے ریفرنڈم کروایا گیا۔ نکرومہ کو اس صدارتی انتخاب میں جے بی ڈینکوا (J. B. Danqua) کے مقابلہ میں بھاری اکثریت سے صدر منتخب کر لیا گیا۔

1961ء میں نکرومہ نے پہلے نکرومہ آئیڈولوجیکل انسٹیٹیوٹ (Nkrumah Ideological Institute) کا سنگ بنیاد رکھا جس کا بنیادی مقصد گھانا کے سول سرونٹس کو تربیت دینا اور پین افریقنزم (Pan-Africanism) کو ترویج دینا تھا۔

1963ء میں گھانا آرگنائزیشن آف افریقن یونٹی کا رکن بن گیا۔ 1963ء میں ہی نکرومہ کو اُن کی خدمات کے پیش نظر سوویت یونین کی جانب سے لینن پیس پرائز (Lenin Peace Prize) دیا گیا۔ گھانا افریقہ کے دیگر ممالک کے مقابلہ میں کافی دولت مند ملک تھا۔ وہاں لاتعداد اسکول، ہسپتال، سوشل سیکورٹی کے ادارے اور ریلوے کا بہترین انتظام موجود تھا۔ نکرومہ کی قیادت میں ملک نے مزید ترقی کی۔ نکرومہ نے گھانا میں کچھ سوشلسٹ پالیسیاں بھی متعارف کروائیں۔ نکرومہ نے گھانا کو ایک فلاحی ریاست بنانے کے لئے ہر ممکن کوششیں کیں اور تعلیم کو عام کرنے کے لئے لاتعداد نئے اسکول تعمیر کروائے۔

نکرومہ نے گھانا کی اکانومی کو تیزی کے ساتھ صنعتی ترقی کے لئے استعمال کیا اُن کا خیال تھا کہ اگر گھانا نوآبادیاتی تجارتی نظام سے باہر نکل جائے تو وہ صحیح معنوں میں آزاد ملک ہوگا۔ بدقسمتی سے صنعتی ترقی سے اُن کے لئے کئی مسائل پیدا ہو گئے۔ انہوں نے جو منصوبے شروع کئے وہ

جمال عبدالناصر

GAMAL ABDEL-NASSER

جدید مصر کے بانی

جمال عبدالناصر کا شمار دنیا کے صف اوّل کے لیڈروں میں کیا جاتا ہے۔ انہوں نے 1954ء میں ایک انقلاب کے ذریعے مصر سے بادشاہت کا خاتمہ کر کے مصر کو ایک جدید ملک بنانے کی بنیاد رکھی اور نہ صرف عرب ممالک بلکہ تیسری دنیا کی سیاست میں انتہائی اہم اور مؤثر کردار ادا کیا۔ جمال عبدالناصر کی شہرت اُس وقت عروج پر پہنچ گئی جب انہوں نے نہر سویز (Suez Canal) کو قومی ملکیت میں لے لیا جس پر انہیں برطانیہ، فرانس اور اسرائیل کی جانب سے شدید حملوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ کسی قسم کے دباؤ کو خاطر میں نہ لائے اور عرب قوم کے مفادات کو مقدم رکھا۔ جمال عبدالناصر بہترین مقرر اور انتہائی کرشماتی شخصیت کے مالک تھے۔

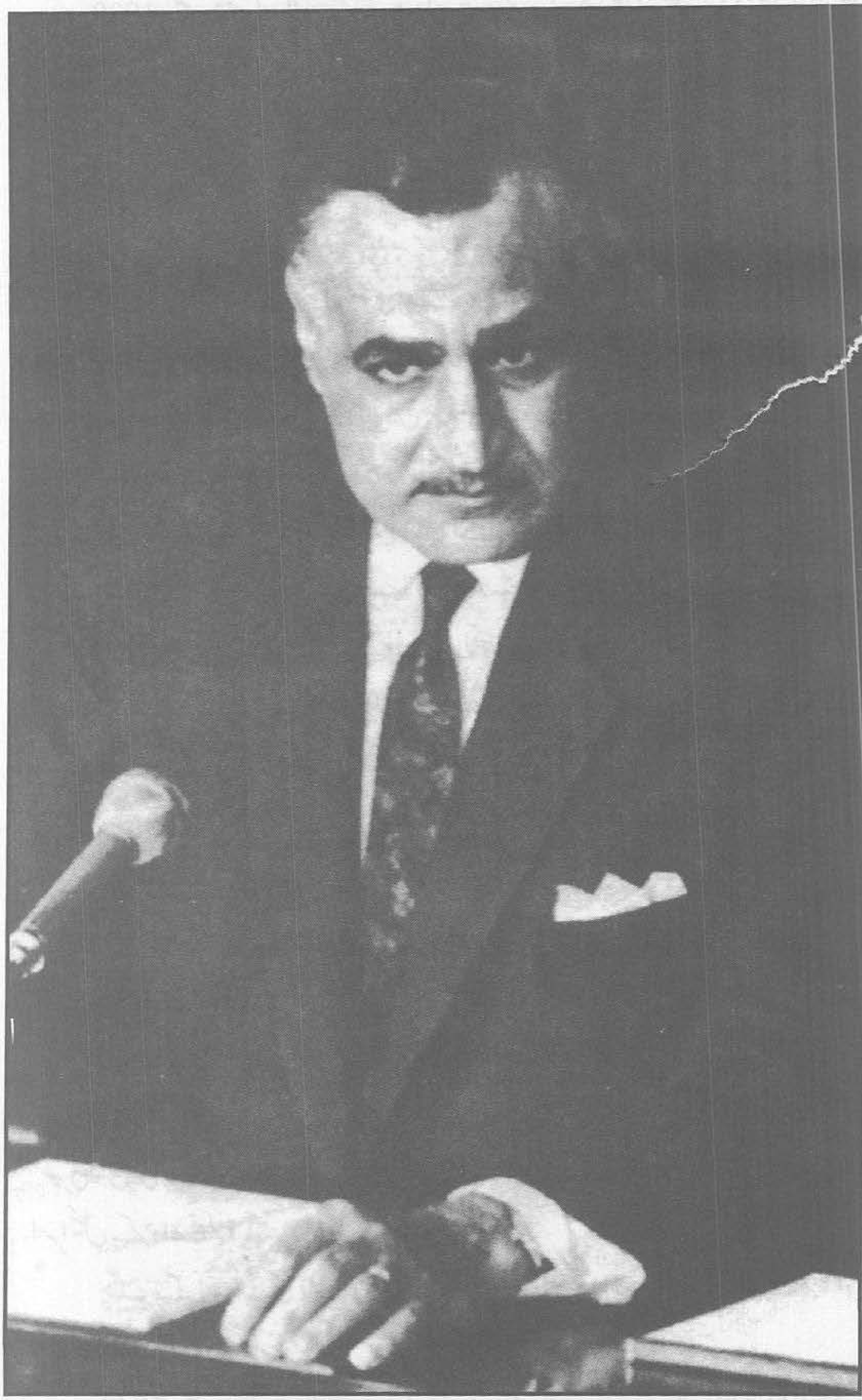
جمال عبدالناصر 15 جنوری 1918ء کو مصر کے شہر اسکندریہ میں پیدا ہوئے۔ جمال کے دو بھائیوں سمیت ان کے والدین 1921ء میں Asyut اور پھر 1923ء میں Khatatba شہر منتقل ہو گئے۔ جہاں اُن کے والد عبدالناصر حسین ایک پوسٹ آفس چلاتے تھے۔ جمال عبدالناصر نے ابتدائی تعلیم ریلوے کے ایک سکول میں حاصل کی اور 1924ء میں انہیں مزید تعلیم کے لئے اپنے چچا خلیل حسین کے پاس قائرہ بھیج دیا گیا۔ 1926ء میں جمال عبدالناصر کی والدہ کا انتقال چھوتے بیٹے کی پیدائش کے موقع پر ہو گیا۔ جمال عبدالناصر کو اپنی والدہ سے بے حد محبت تھی اور والدہ کے انتقال نے ان کے دل اور دماغ پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ اُسی سال ان کے والد نے دوسری شادی کر لی۔ جمال عبدالناصر 1928ء میں اپنے نانا محمد حماد کے پاس اسکندریہ چلے گئے اور اٹارین ایلیمنٹری

میں وہ علاج کی غرض سے رومانیہ کے شہر بخارسٹ چلے گئے جہاں اپریل 1972ء میں 62 برس کی عمر میں وہ وفات پا گئے۔

نکرومہ آج بھی ہسٹری میں سب سے زیادہ قابل احترام لیڈر کا درجہ رکھتے ہیں سن 2000ء میں انہیں افریقہ کے مین آف دی میلینیم (Africa's Man of Millennum) قرار دیا گیا۔

نکرومہ کو اپنی زندگی میں اعلیٰ خدمات کے اعتراف میں Lincoln University USA، Moscow State University، Cairo University Egypt، Jagiellonian Univesity Polande، Humboldt Univdrsity East Berlin اور دیگر کئی یونیورسٹیوں نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں عطا کیں۔

وفات کے بعد نکرومہ کو اپنے آبائی گاؤں Nkroful میں دفن کیا گیا اور وہاں اُن کا شاندار مقبرہ تعمیر کیا گیا۔ بعدازاں اُن کی یاد میں گھانا کے دارالحکومت Accra میں عظیم الشان مقبرہ اور پارک تعمیر کیا گیا۔



سکول (Attarin Elementry Shcool) میں داخلہ لے لیا۔ اس سکول میں ان کی کارکردگی بہتر ثابت نہ ہوئی اور 1929ء میں انہیں دوبارہ قائرہ بھیج دیا گیا۔ جلد ہی جمال کے والد کی ٹرانسفر سویز میں ہوگئی اور انہیں وہاں جانا پڑا مگر 1933ء میں وہ پھر اپنے چچا کے پاس قائرہ آ گئے۔ 1936ء میں جمال اپنے نانا کے پاس اسکندریہ چلے گئے اور وہاں انہوں نے ایک پرائیویٹ اسکول سے سیکنڈری ایجوکیشن سٹوفکیٹ حاصل کیا۔

12 نومبر 1935ء کو جمال عبدالناصر برطانوی حکومت کے خلاف کئے جانے والے ایک مظاہرے میں شرکت کے دوران زخمی ہو گئے اور بعدازاں گرفتار ہوکر مصری سوشلسٹ پارٹی کے متعدد ممبران کے ہمراہ دو روز تک جیل میں رہے۔ سیکنڈری سکول میں تعلیم کے دوران جمال عبدالناصر سیاسی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے رہے اور 36-1935ء کے عرصہ میں جمال قائرہ کے سیکنڈری سکولز کی اسٹوڈنٹس یونین کے چیئر مین منتخب ہوتے رہے۔ بار بار سکول بدلنے کے عمل نے جمال عبدالناصر کو مایوس نہیں کیا بلکہ اس دوران ان کے حوصلے، تجربے اور دوستوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا جو بعد کی انقلابی جدوجہد میں اُن کے بہت کام آیا۔

1944ء میں جمال عبدالناصر نے ایک ایرانی تاجر کی 22 سالہ بیٹی طاہیا کاظم سے شادی کر لی۔ طاہیا کے والدین اس کی کم سنی میں ہی وفات پا گئے تھے اور طاہیا کے چچا عبدالحمید کاظم نے جمال سے اُس کی شادی کا اہتمام کیا۔

شادی کے بعد جمال عبدالناصر اپنی بیوی کے ہمراہ قائرہ کے اطراف میں ایک گھر میں منتقل ہو گئے۔ 1937ء میں جمال عبدالناصر کو فوج میں آفیسر کے طور پر ملازمت مل گئی۔ اس ملازمت سے نہ صرف اُن کے مالی حالات اچھے ہو گئے بلکہ معاشرہ میں ایک باعزت مقام بھی مل گیا تاہم فوج کی ملازمت کے دوران بھی جمال عبدالناصر کی سیاست سے دلچسپی برقرار رہی۔

جمال اور طاہیا کے ہاں دو بیٹیاں اور تین بیٹے پیدا ہوئے۔ ان کی بڑی بیٹی بعدازاں قائرہ یونیورسٹی میں پولیٹکل سائنس کی پروفیسر بنیں۔

ملٹری اکیڈمی کی ٹریننگ کے دوران جمال عبدالناصر کی ملاقات عبدالحکیم عامر اور انوار السادات سے ہوئی جو بعدازاں جمال عبدالناصر کے دورِ صدارت میں ان کے دست راست رہے۔ ملٹری اکیڈمی سے پاس اوٹ ہونے کے بعد ان کی تقرری مانک آباد (Mankabad) شہر میں انفنٹری کے سیکنڈ لیفٹینٹ کے طور پر ہوئی۔



صدر جمال عبدالناصر لیبیا کے حکمران معمر قذافی کے ہمراہ



صدر جمال عبدالناصر بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی کے ہمراہ

1939ء میں ناصر اور ان کے دست راست عاجر نے رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات سوڈان کے لئے پیش کر دیں سوڈان ان دنوں مصر کا اتحادی ملک تھا۔ جہاں ان کے پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد ہی دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا ناصر اور عامر 1941ء تک سوڈان میں ہی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ جنگ عظیم کے دوران انہوں نے دیگر فوجی گروپوں کی مدد سے مصر سے برطانوی فوجوں کو نکال باہر کرنے کلا منصوبہ بنایا مگر اس منصوبہ پر عمل درآمد کا موقع نہ ملا۔

1942ء میں مصر کے وزیراعظم علی مہر سے برطانوی حکومت کی بعض وجوہات پر ناراضگی کے باعث مصر میں برطانوی ہائی کمشنر لارڈ لیمسن (Lord Lamsan) کی ایماء پر ایک برطانوی فوجی دستے نے مصر کے بادشاہ فاروق کے محل میں جبراً داخل ہو کر وزیراعظم علی مہر کو برطرف کرنے پر زور دیا۔ برطانوی فوج کے اس طرز عمل کو مصر کے تمام شہریوں کی طرح جمال عبدالناصر نے بھی مصر کی خودمختاری کے خلاف اقدام تصور کیا اور اپنی ہائی کمان کو ایک خط میں لکھا۔ ''میرا سر شرم سے جھک گیا ہے کہ ہماری فوج نے برطانوی فوج کے اس عمل کا بھرپور جواب کیوں نہیں دیا'' بعدازاں جمال عبدالناصر اور عامر نے فوج کے مختلف یونٹوں میں انقلاب کے حامی افسران سے روابط بڑھا لئے اور راست اقدام کے لئے مناسب وقت کا انتظار کرنے لگے۔

دوسری جنگ عظیم میں مصر کی فوج غیر جانبدار رہی تاہم جمال عبدالناصر کو میدان جنگ میں جانے کا پہلا موقع سرزمین فلسطین پر ملا۔ فلسطین میں عرب فوج کی باضابطہ آمد سے قبل اپنی خدمات عرب ہائر کمیٹی (Arab Higher Committee) جس کی قیادت بیت المقدس کے عظیم مفتی امین الاحسینی کر رہے تھے کے لئے پیش کیں لیکن مصر کی حکومت نے ناصر کو امین الاحسینی کی فورس میں شرکت کی اجازت نہ دی۔

1948ء میں مصر سے برطانوی فوج کے انخلاء کے بعد شاہ فاروق نے مصری فوج کو فلسطین بھیجا۔ جمال عبدالناصر نے چھٹی انفینٹری بٹالین میں خدمات سرانجام دیں۔ جنگ کے دوران ناصر مصری فوج کی کارکردگی سے بالکل مطمئن نہیں تھے۔ اس جنگ میں مصر نے فالوجہ Faluja کا علاقہ اسرائیل کے حوالے کر دیا۔

جنگ کے بعد فروری 1949ء میں جمال عبدالناصر کو رائل ملٹری اکیڈمی قاہرہ کا انسٹرکٹر (Instructor) بنا دیا گیا۔

1949ء میں جمال عبدالناصر نے اپنے حامی افسران کے گروپ کو ''ایسوسی ایشن آف فری

آفیسرز" (Association of Free Officer) کا نام دے دیا اور اس گروپ نے ناصر کو اپنا بلا مقابلہ چیئرمین منتخب کرلیا۔ اس گروپ کی فاؤنڈنگ کمیٹی 14 ارکان پر مشتمل تھی بعدازاں اس میں دیگر سیاسی گروپوں سے مزید اہم افراد بھی شامل ہو گئے اور کمیٹی کے ممبران کی تعداد بڑھ کر 90 ہو گئی اور انہوں نے زیرزمین اپنی سرگرمیاں بڑھا دیں 25 جنوری 1952ء کو نہر سویز پر مامور برطانوی فوج کی اسماعیلیہ کی پولیس فورس سے شدید جھڑپ ہوئی جس کے نتیجہ میں چالیس مصری پولیس مین مارے گئے۔ اس واقعہ کے ردعمل کے طور پر اگلے روز ہزاروں لوگ سڑکوں پر نکل آئے اور انہوں نے برطانوی فوج کے حامی سرکاری اہل کاروں اور سرکاری عمارتوں پر ہلہ بول دیا۔ اس شورش کے دوران 76 افراد لقمہ اجل بن گئے جس میں 9 برطانوی باشندے بھی تھے۔ اس موقع پر جمال عبدالناصر اور خالد محی الدین نے ایک چھ نکاتی پروگرام برائے مصر جاری کیا جس میں مصری معاملات میں برطانیہ کی بڑھتی ہوئی دخل اندازی کو زبردست تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ اس دوران جمال عبدالناصر تک معتبر ذرائع سے یہ خبر پہنچی کہ شاہ فاروق کو ایسوسی ایشن آف فری آفیسرز کے بارے میں معلومات حاصل ہوگئی ہیں اور وہ انہیں گرفتار کرنے کے احکامات جاری کرنے والے ہیں۔ اس خبر پر ناصر نے اپنے قریبی ساتھیوں سے مشورہ کیا اور شاہ فاروق کا تختہ الٹنے کے لئے منصوبہ بندی کر لی۔ جمال عبدالناصر چونکہ فوج میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدہ پر فائز رہے تھے اور انہیں خطرہ تھا کہ اگر وہ براہ راست حکومت کا کنٹرول سنبھالیں گے تو فوجی اور سول بیوروکریسی انہیں قبول نہیں کرے گی لہٰذا انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ جنرل نجیب کی قیادت میں حکومت کا تختہ الٹیں گے اور درپردہ ایسوسی ایشن آف فری آفیسرز تمام حکومتی معاملات کو کنٹرول کرے گی منصوبہ بندی کے مطابق 22 جولائی 1952ء کو فوجی بغاوت کے ذریعے شاہ فاروق کی حکومت کا تختہ الٹنے کا عمل شروع کیا گیا اور اگلے روز ہی انقلاب کا عمل مکمل ہو گیا۔ جنرل نجیب کو ملک کا صدر قرار دیا گیا اور شاہ فاروق کو بغیر نقصان پہنچائے ملک چھوڑ جانے کی اجازت دے دی گئی۔ انقلاب کے بعد ایسوسی ایشن آف فری آفیسرز کا نام تبدیل کر کے Egyptian Revolutionary Command Council رکھ دیا گیا۔ جنرل نجیب کو کونسل کا چیئرمین اور کرنل جمال عبدالناصر کو وائس چیئرمین منتخب کرلیا گیا اس کے ساتھ ہی جنرل نجیب کو وزیراعظم اور جمال عبدالناصر کو نائب وزیراعظم اور وزیرداخلہ کا اضافی چارج بھی دے دیا گیا۔

نئی حکومت نے ملک میں متعدد انقلابی اصلاحات کیں اور ملک و قوم کو ترقی کے ایک نئے

راستے پر گامزن کر دیا۔

جنوری 1953ء میں جمال عبدالناصر نے تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد کر کے ملک میں یک جماعتی نظام نافذ کر دیا۔ ملک کی سیاسی جماعتوں نے اس عمل کی زبردست مخالفت کی لیکن ناصر نے ال اظہر یونیورسٹی کے علماء کی حمایت حاصل کر کے حالات پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ اس دوران جنرل نجیب نے کوشش شروع کر دی کہ حکومت پر وہ اپنی گرفت کر لیں اور جمال عبدالناصر کے اثر و رسوخ کو کم کر دیں۔ جنرل نجیب کی ان کوششوں سے ناصر بھی بے خبر نہ تھے لہٰذا انہوں نے فوج میں اپنے حامیوں کی مدد سے جنرل نجیب کو برطرف کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

فروری 1954ء میں ناصر کی وفادار فوجی یونٹ نے جنرل نجیب کو اغوا کر کے اعلان جاری کر دیا کہ جنرل نجیب کو ان کے عہدہ سے ہٹا دیا گیا ہے۔ انقلابی کمانڈ کونسل نے فوری طور پر ناصر کو ملک کا وزیراعظم نامزد کر دیا۔ تاہم انقلابی کونسل کے چند سرکردہ راہنماؤں جن کی قیادت خالد محی الدین کر رہے تھے، نے جنرل نجیب کو دوبارہ صدر کے طور پر بحال کر دیا گیا لیکن اس سے قبل جمال عبدالناصر نے اپنے دست راست عامر کو آرمڈ فورسز کا کمانڈر مقرر کر دیا۔ بعدازاں خالد محی الدین کو یورپ میں جلاوطن کر دیا گیا۔ اس دوران ناصر کے حامیوں نے جن میں محمد حسنین ہیکل بھی شامل تھے جنرل نجیب کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ مہم شروع کر دی۔

جولائی 1954ء میں جمال عبدالناصر نے برطانوی حکومت کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کے نتیجہ میں نہر سویز پر برطانوی حکومت کا عمل دخل ختم ہو گیا۔

26 اکتوبر کو جمال عبدالناصر نہر سویز پر برطانوی کنٹرول کے خاتمہ کی خوشی میں اسکندریہ شہر میں ایک جلسہ عام سے خطاب کر رہے تھے کہ سیاسی جماعت برادرہڈ (Brotherhood) کے ایک ممبر محمد عبداللطیف نے صدر ناصر کو قتل کرنے کی کوشش کی اور تقریر کے دوران ان پر سات گولیاں چلائیں مگر خوش قسمتی سے جمال عبدالناصر اس قاتلانہ حملہ میں محفوظ رہے۔ پورے جلسہ میں خوف و ہراس پھیل گیا لیکن ناصر نے عوام کو حوصلہ دیتے ہوئے ایک زبردست جذباتی تقریر کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر آج ناصر ہلاک ہو جاتا تو کوئی فرق نہ پڑتا کیونکہ اب آپ سب ناصر ہو۔ ناصر آپ میں سے ہے اور وہ آپ کے لئے اپنی جان کی قربانی دینے کے لئے ہر وقت تیار ہے''۔ ناصر پر قاتلانہ حملے اور اُن کی جذباتی تقریر نے ملک بھر میں اُن کی عوامی مقبولیت میں بے حد اضافہ کر دیا اور اُن کے مخالفین کے لئے عوام کے دلوں میں نفرت پیدا ہو گئی۔

اس واقع کے بعد قاہرہ واپسی پر جمال عبدالناصر نے سیاسی جماعتوں کے خلاف مصر کی تاریخ کے سب سے بڑے کریک ڈاؤن (Crackdown) کا حکم دیا اور 20000 سے زائد افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔ ناصر نے اپنے قریبی ساتھی جمال سالم کو ملٹری ٹریبونل کا سربراہ بنا کر سیاسی مخالفین کے مقدمات چلائے۔ برادرہڈ تنظیم کے آٹھ مرکزی راہنماؤں کو سزائے موت دے دی گئی۔ جنرل نجیب کو عہدہ صدارت سے ہٹا کر گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ یہ کریک ڈاؤن 1955ء تک جاری رہا۔ برادرہڈ تنظیم پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی اور اس کے اکثر بڑے لیڈر فرار ہو کر دیگر عرب ممالک میں چلے گئے۔ اب جمال عبدالناصر کو امور مملکت پر مکمل کنٹرول حاصل ہو گیا۔

28/فروری 1955ء کو اسرائیل نے مصر کے زیر کنٹرول علاقہ غزہ کی پٹی پر حملہ کر دیا تاکہ فلسطینی فدائین کا خاتمہ کیا جا سکے۔ صدر ناصر اس وقت اسرائیل کو منہ توڑ جواب نہ دے سکے جس سے عرب دنیا میں اُن کی مقبولیت میں کمی واقع ہوئی۔ بعدازاں اپنی فوجی قوت کو بڑھانے کے لئے صدر ناصر نے سوویت بلاک سے روابط بڑھائے اور ستمبر 1955ء میں چیکوسلاوکیہ سے جدید ہتھیاروں کی سپلائی کا معاہدہ کیا اور اس طرح صدر ناصر اس قابل ہو گئے کہ ایک عرب لیڈر کے ناطے وہ مغربی ممالک کو آنکھیں دکھا سکیں۔

جنوری 1956ء میں صدر ناصر نے مصر کو ایک نیا آئین دیا جس میں سنگل پارٹی سسٹم متعارف کرایا گیا اور مصر کی واحد سیاسی جماعت کے طور پر ''نیشنل یونین'' کا قیام عمل میں آیا جس کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ صدارتی امیدوار کے طور پر کسی ایک شخص کا نام تجویز کرے گی جو ریفرنڈم کے ذریعے عوام کی حمایت حاصل کرے گا۔ نیشنل یونین نے جمال عبدالناصر کا نام بطور صدر تجویز کیا اور جون 1956ء میں عوامی ریفرنڈم کے ذریعے ناصر صدر منتخب ہو گئے اور اس کے ساتھ انقلابی کمانڈ کونسل بھی ختم کر دی گئی۔

جمال عبدالناصر عرب ممالک کے اتحاد کے بہت بڑے داعی تھے 1957ء میں انہوں نے شام کے لیڈروں سے مذاکرات کر کے مصر اور شام کے ادغام کا فارمولا طے کر لیا اور یکم فروری 1958ء کو شام اور مصر مدغم ہو گئے اور ''یونائیٹڈ عرب (UAR) ریپبلک'' کے نام سے ایک نیا ملک وجود پذیر ہوا۔ جمال عبدالناصر اس ریپبلک Republic کے پہلے صدر منتخب کر لئے گئے۔

24/فروری 1958ء کو شمالی یمن کے بادشاہ احمد بن یحیٰی نے بھی اپنے نمائندے کراؤن پرنس امام بدر کے ذریعے صدر ناصر سے خواہش ظاہر کی کہ ان کے ملک کو بھی یونائیٹڈ عرب ریپبلک

(UAR) میں شامل کر لیا جائے لیکن صدر ناصر نے اس موقع پر شمالی یمن کی UAR میں شمولیت کو پذیرائی نہ دی۔

14 / جولائی 1958ء کو عراقی فوج کے افسران عبدالکریم قاسم اور عبدالسلام نے ایک فوجی ایکشن کے ذریعے عراقی بادشاہ فیصل کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور کنگ فیصل کو موقع پر ہی ہلاک کر دیا۔ صدر ناصر نے عراق میں انقلاب کا خیر مقدم کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس انقلاب کے بعد عراق بھی یونائیٹڈ عرب ریپبلک میں شامل ہو جائے گا مگر عراق کے نئے لیڈر عبدالکریم قاسم صدر ناصر کو پسند نہیں کرتے تھے لہٰذا صدر ناصر کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ ادھر شام کے اندر بھی طاقتور سیاسی گروپوں نے صدر ناصر کی پالیسیوں پر عدم اطمینان کا اظہار کر دیا۔ شامی فوج کے افسران بھی مصر کی بالادستی کے خلاف مزاحمت کرنے لگے۔ شام کے عوام بھی سمجھنے لگے کہ مصر کے ساتھ الحاق کے بعد شام کی اقتصادی حالت بہت خراب ہوگئی ہے۔

28 / ستمبر 1961ء کو شام کے دارالحکومت دمشق میں شامی فوجی یونٹوں نے ''یونائیٹڈ عرب ریپبلک'' کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور شام کے ایک آزاد ملک ہونے کا اعلان کرتے ہوئے صدر ناصر کے نامزد کردہ حکمرانوں عامر اور سراج کو ملک بدر کر دیا۔ صدر ناصر نے سعودی عرب، عراق اور اردن کے حکمرانوں کو UAR توڑنے کا ذمہ دار قرار دیا۔ UAR کے ٹوٹنے کا صدر ناصر کو بہت صدمہ ہوا اور اس صدمہ کے اُن کی صحت پر بہت برے اثرات مرتب ہوئے۔ بعدازاں انہوں نے اندرون ملک اصلاحات پر توجہ دی اور مصر کی واحد سیاسی جماعت نیشنل یونین کو عرب سوشلسٹ یونین کا نام دے کر سوشلسٹ ایجنڈا پر کام کرنے کو ترجیح دی۔ سوویت یونین کے اسٹائل پر امور مملکت چلانے پر ان کے بہت سے ساتھی استعفیٰ دینے پر مجبور ہو گئے جنوری 1964ء میں صدر ناصر نے قائرہ عرب لیگ سمٹ کانفرنس منعقد کی جس کا مقصد اسرائیل کی جارحیت کے خلاف عرب ممالک کو متحد کرنا تھا۔ صدر ناصر نے اس موقع پر تجویز پیش کی کہ عرب ممالک کو یونائیٹڈ عرب کمانڈ (UAC) قائم کرنی چاہئے۔ 1964ء کے آخر میں صدر ناصر کو غیر جانبدار ممالک کی تنظیم (NAM) کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ اسی سال انہوں نے اس تنظیم کی کانفرنس قائرہ میں منعقد کی۔ مارچ 1965ء میں صدر ناصر عام انتخابات میں اگلے چھ برس کے لئے مصر کے صدر منتخب ہو گئے۔ ان کے مقابلہ میں کوئی امیدوار نہیں تھا۔ اس سال انہوں نے مسلم برادرہڈ تنظیم کے سربراہ سید قطب کو قید کر دیا اور 1966ء میں انہیں پھانسی دے دی گئی۔ مسلم برادرہڈ نے اس کے جواب میں صدر

ناصر کے لئے سزائے موت سنادی۔

1966ء میں صدر ناصر کو دل کا دورہ پڑا مگر اُن کی جان محفوظ رہی۔

اپریل 1967ء میں اسرائیل نے شام پر حملہ کر دیا اور شام کے چھ طیارے مار گرائے۔ صدر ناصر نے شام کی مدد کے لئے اپنی فوجیں بھیجیں۔ جنگ میں عربوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور اسرائیل نے عربوں کے متعدد علاقے قبضہ میں لے لئے۔ 8/جون 1967ء کو صدر ناصر نے ایک ٹیلی وژن خطاب میں اپنی قوم کو بتایا کہ اُن کے ملک کو اس جنگ میں شکست ہوگئی ہے اور ساتھ ہی انہوں نے عہدہ صدارت سے اپنے استعفیٰ کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلان سنتے ہی ہزاروں لوگ سڑکوں پر نکل آئے اور انہوں نے صدر ناصر کے استعفیٰ کو نامنظور کر دیا۔ نومبر 1967ء میں اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر 242 کے ذریعے اسرائیل کی طرف سے جنگ میں قبضہ کئے ہوئے علاقوں کی واپسی کا اعلان کیا گیا جس پر صدر ناصر نے اطمینان کا اظہار کیا۔

جنوری 1968ء میں صدر ناصر نے اسرائیل کا زور توڑنے کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ اسی سال مارچ میں فلسطینی لیڈر یاسر عرفات کی قیادت میں الفتح کے فدائین نے اسرائیل پر حملے شروع کئے۔ اسرائیل نے تمام جنگی وسائل استعمال کرتے ہوئے عربوں پر چڑھائی کر دی مگر سخت مزاحمت پر اسرائیل فوج کو پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ اس جنگ کے فوراً بعد صدر ناصر نے یاسر عرفات کو قاہرہ آنے کی دعوت دی اور انہیں مصر کی طرف سے ہر قسم کی امداد فراہم کرنے کا اعلان کیا۔

نومبر 1969ء میں صدر ناصر نے فلسطینی قیادت اور لبنانی فوج کے درمیان ایک معاہدہ کروا دیا جس کے تحت فلسطینی جنگجو اسرائیل پر حملہ کے لئے لبنان کی سرزمین استعمال کر سکتے تھے۔ دسمبر 1969ء کو صدر ناصر نے انوار السادات اور حسین الشافی کو مصر کا نائب صدر مقرر کر دیا۔

جون 1970ء میں صدر ناصر نے اردن کے شاہ حسین کے تعاون سے روجرز پلان Rogar's Plan قبول کر لیا۔

27/ستمبر 1970ء کو صدر ناصر نے عرب لیگ کے سربراہوں کی ہنگامی کانفرنس قاہرہ میں طلب کی جس کا مقصد عرب قائدین کے درمیان اختلافات کو ختم کرنا تھا لیکن وہ شاہ حسین اور یاسر عرفات کے اختلافات ختم کرانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ 28/ستمبر 1970ء کو سربراہی کانفرنس کے اگلے روز کویت کے امیر صباح دوئم ساتھ چلتے ہوئے جمال عبدالناصر کو دل کا دورہ پڑا جس کے باعث وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

ہو چی منہ

Ho Chi Minh

ہو چی منہ ویتنام کے عظیم سوشلسٹ انقلابی لیڈر تھے جنہوں نے اپنی برس ہا برس کی مسلسل جدوجہد کے ذریعے اپنے وطن عزیز کو پہلے جاپان، پھر فرانس اور پھر امریکہ کے چنگل سے آزاد کروایا اور ویتنام کو ایک خودمختار اور مضبوط ملک بنا دیا۔ ویت نام کے عوام ہو چی منہ کو صرف ایک قومی ہیرو ہی نہیں بلکہ ایک دیوتا کا درجہ دیتے ہیں۔ ویت نام کا سب سے بڑا شہر جس کی آبادی تقریباً 2 کروڑ افراد پر مشتمل ہے، ہو چی منہ کے نام سے منسوب ہے۔

ویت نام کے یہ عظیم سپوت 19 مئی 1890ء کو ہوانگ نامی ایک گاؤں جو اُن کے والد کا آبائی گاؤں تھا، میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والدین نے اُن کا نام نیومن سن کنگ رکھا جو 1940ء تک اُن کی پہچان رہا تاہم 1940ء میں انہوں نے اپنا نام تبدیل کر کے ہو چی منہ (Ho chi minh) رکھ لیا جس کے معنی ہیں ''روشنی لانے والا''۔ ہو چی منہ کے والد ایک سکول ٹیچر تھے۔ ہو چی منہ کی ایک بہن اور دو بھائی تھے۔ ہو چی منہ نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے والد کے ہمراہ اس وقت کے ایک سکالر تھک دو Thuc Do سے حاصل کی اور بہت جلد وہ چینی زبان لکھنے اور پڑھنے کے قابل ہو گئے۔ ویتنامی زبان میں تعلیم بھی ساتھ ساتھ چلی۔ اُن دنوں ویتنام پر فرانس کا قبضہ تھا لہٰذا ہو چی منہ کو فرانسیسی زبان کی تعلیم بھی حاصل کرنا پڑی جو انہوں نے ہوئے (Hue) میں قائم ایک فرانسیسی سکول سے حاصل کی۔ ضروری تعلیم کے حصول کے بعد انہوں نے ایک سکول میں بطور ٹیچر کے ملازمت اختیار کی۔

1912ء میں ہو چی منہ ایک بحری جہاز کے عملہ میں بطور باورچی شامل ہو گئے اور انہیں بحری

جہاز پر امریکہ کا سفر کرنے کا موقع مل گیا۔ 1912ء سے 1913ء تک ہو چی منہ امریکہ کے شہر نیورک اور بوسٹن میں مقیم رہے جہاں انہوں نے ایک ہوٹل کی بیکری میں معمولی تنخواہ پر کام کیا۔ 1917ء اور 1918ء میں انہیں ایک مرتبہ پھر امریکہ میں قیام پذیر ہونے کا موقع مل گیا۔ اس بار امریکہ میں قیام کے دوران انہیں کوریا کے قوم پرستوں سے گہرے تعلقات بنانے کا موقع نصیب ہوا جو بعدازاں اپنے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں ان کے کام آیا۔ 1913ء سے 1919ء تک ہو چی منہ برطانیہ کے دارالحکومت لندن کے مختلف علاقوں میں بھی مقیم رہے جہاں انہوں نے ڈرائٹن کورٹ ہوٹل (Drayton Court Hotal) میں بطور باورچی کام کیا۔ 1917ء میں لینن کی قیادت میں روس میں برپا ہونے والے انقلاب نے ہو چی منہ کو بہت متاثر کیا۔ 1919ء سے 1923ء تک ہو چی منہ فرانس میں مقیم رہے جہاں انہیں کمیونزم (Communism) سے دلچسپی پیدا ہوئی اور 1921ء میں فرانس کے شہر تور (Tours) میں منعقدہ کانفرنس کے دوران وہ فرانس کی کمیونسٹ پارٹی کے بنیادی رکن بن گئے۔ 1923ء میں ہو چی منہ فرانس کے دارالحکومت پیرس کو چھوڑ کر سوویت یونین کے دارالحکومت ماسکو چلے گئے۔ جہاں انہوں نے 1924ء میں کمیونزم کے بارے میں منعقدہ پانچویں کانگرس میں شرکت کی۔

1925-26ء کے دوران ہو چی منہ نے وامپوا ملٹری اکیڈمی (Whampoa Military Academy) میں یوتھ ایجوکیشن کلاسز کا سلسلہ شروع کیا اور وہ اکثر ان کلاسوں میں انڈو چائنہ میں انقلابی تحریک پر لیکچر دیا کرتے تھے۔

18 اکتوبر 1926ء کو انہوں نے ایک چینی خاتون سے شادی کر لی۔ اس وقت ہو چی منہ کی عمر 36 برس جبکہ ان کی ہونے والی بیوی کی عمر 21 برس تھی۔ اپنی بیوی کی مدد سے انہوں نے چینی زبان پر عبور حاصل کر لیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہو چی منہ کی شادی کی تقریب اسی جگہ منعقد ہوئی جہاں چین کے اہم راہنما چواین لائی کی شادی ہوئی تھی۔

1927ء میں چین کے حکمران چیانگ کائی شیک (Chiang Kai-Shek) کے خلاف ماؤزے تنگ کے ساتھیوں کی بغاوت نے ہو چی منہ کے لئے چین میں رہنا ناممکن بنا دیا لہٰذا وہ اپریل 1927ء میں ماسکو واپس چلے گئے۔ جولائی 1928ء کو ہو چی منہ برسلز، برلن، سوئٹزرلینڈ اور اٹلی سے ہوتے ہوئے تھائی لینڈ کے دارالحکومت بنکاک پہنچ گئے۔ وہ 1929ء تک تھائی لینڈ میں رہے اور 1929ء کے آخر میں ہانگ کانگ اور پھر شنگھائی چلے گئے۔ جون 1931ء، میں ہو چی

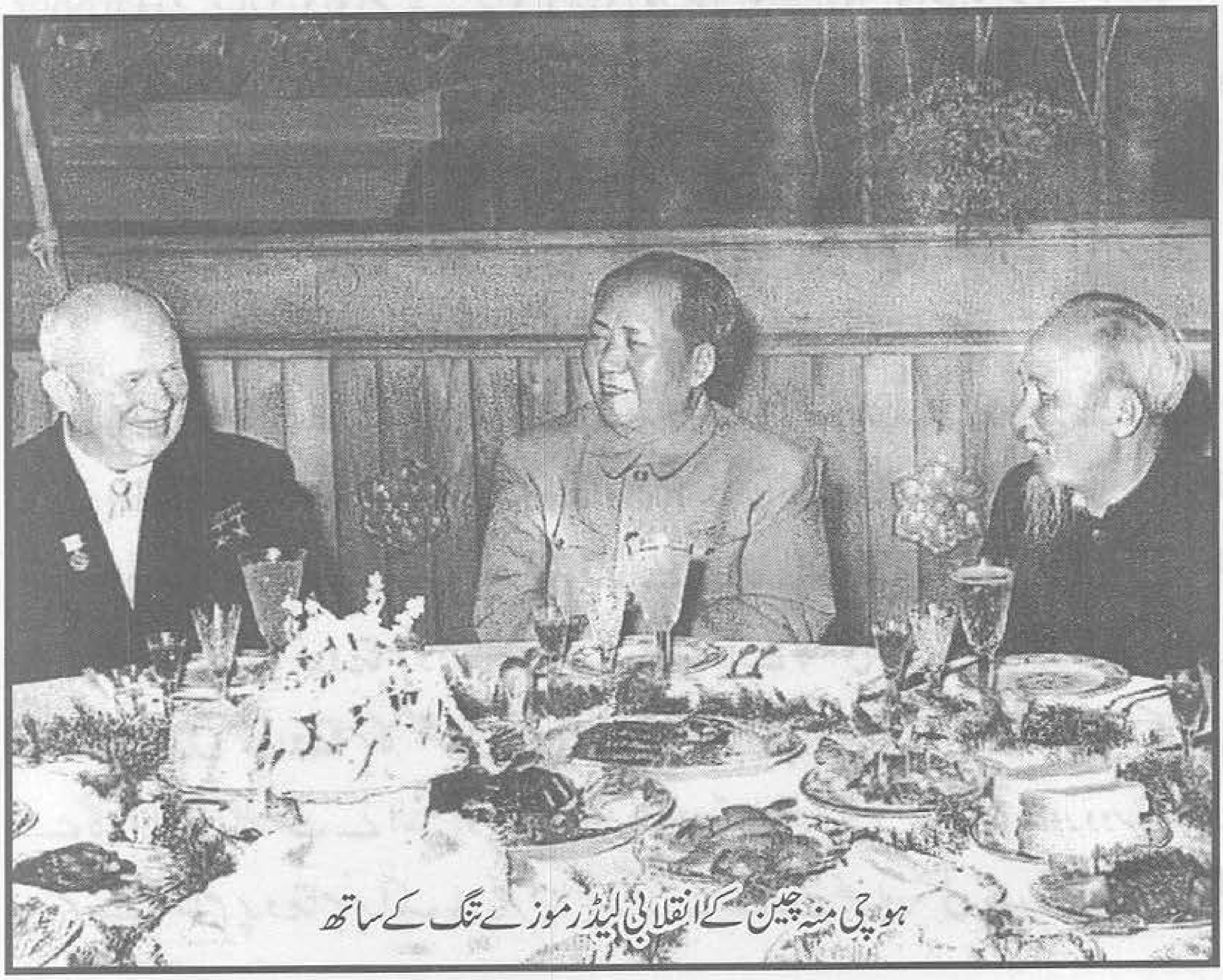


منہ کو ہانگ کانگ میں گرفتار کر لیا گیا۔ فرانس کی حکومت نے ہانگ کانگ کی حکومت پر دباؤ ڈالا کہ ہوچی منہ کو ان کے حوالے کیا جائے لیکن ہانگ کانگ کی حکومت نے ان کی جان بچانے کے لئے اعلان کر دیا کہ وہ وفات پا گئے ہیں۔ بعدازاں برطانوی حکومت کی خواہش پر ہوچی منہ کو خاموشی کے ساتھ جنوری 1933ء میں رہا کر دیا گیا۔ رہائی پر وہ اٹلی کے شہر میلان (Milan) چلے گئے جہاں انہوں نے ایک ریسٹورنٹ میں ملازمت اختیار کر لی۔ کچھ عرصہ بعد وہ ایک بار پھر سوویت یونین چلے گئے اور کافی عرصہ وہاں مقیم رہے۔

1938ء میں وہ پھر چین چلے گئے اور چین کی کمیونسٹ پارٹی کے ایک فوجی یونٹ سے بطور مشیر وابستہ ہو گئے۔

1941ء میں ہوچی منہ اپنے ملک ویتنام چلے گئے اور ویتنام کی تحریک آزادی کی قیادت کرنے لگے۔ 1942ء میں چینی کمیونسٹوں کی مدد کے لئے کچھ عرصہ کے لئے چین گئے جہاں چیانگ کائی شیک کے حامیوں نے انہیں گرفتار کر لیا اور تقریباً ایک برس تک جیل میں رکھا۔ 1943ء میں رہائی پانے کے بعد ہوچی منہ واپس ویتنام چلے گئے۔ 1944ء میں ہوچی منہ نے ایک اور خاتون دوتھی لک (Dothi Lac) سے شادی کی جس سے 1956ء میں اُن کا ایک بیٹا پیدا ہوا۔

ویتنام کی آزادی کی جدوجہد میں ہوچی منہ کی بہن نے بھی اہم کردار ادا کیا وہ فرانسیسی فوج میں ملازم ہو گئیں وہ خفیہ طور پر فرانسیسی فوج کی نقل و حرکت سے اپنے ویتنامی جنگجوؤں کو نہ صرف آگاہ کرتیں بلکہ فرانسیسی فوج کا جدید اسلحہ بھی اپنے ساتھیوں کو فراہم کرتیں۔ بالآخر وہ پکڑی گئیں اور فرانسیسی حکومت نے انہیں عمر قید کی سزا سنائی۔ یہاں یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ 1940ء میں جاپانی فوج نے انڈوچائنا (Indochina) پر حملہ کیا تو فرانس جو پہلے ہی جرمن فوجوں کے ہاتھوں شکست کھا چکا تھا نے جاپانی فوج کا مقابلہ نہ کیا اور اُن کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ ہوچی منہ اور اُن کے ساتھیوں کو فرانس کی اس شکست سے حوصلہ ملا اور انہیں اپنے ملک کی آزادی کا حصول ممکن نظر آنے لگا اور انہوں نے ایک تنظیم کے قیام کا اعلان کر دیا جسے Vietminh کا نام دیا گیا جس کا مطلب نیشنل انڈیپنڈس موومنٹ یعنی ''قومی تحریک آزادی'' تھا۔ ویتنام کے قوم پرست فوجی جنرل Vo Nyuyen کو اس تحریک کی قیادت دی گئی اور اس کا باقاعدہ اعلان جنوبی چین میں مئی 1941ء کو کیا گیا۔ اس تنظیم نے جاپان کی ویتنام پر قابض فوج کے خلاف گوریلا کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔ اس تنظیم کو سوویت یونین سے جدید ہتھیار بھی ملنا شروع ہو گئے اور جب جاپان نے Pearl



ہوچی منہ چین کے انقلابی لیڈر موزے تنگ کے ساتھ



ہوچی منہ ایک غیر ملکی دورے کے دوران

Harbour پر بمباری کی تو امریکہ نے بھی ویتنامی گوریلوں کو ہتھیاروں کی سپلائی شروع کر دی۔

جب اگست 1945 کو امریکہ کی جانب سے جاپان کے دو بڑے شہروں ہیروشیما اور ناگاساقی پر ایٹم بم گرائے گئے تو جاپانی فوجوں نے شکست تسلیم کرتے ہوئے ہتھیار پھینک دیئے۔ ان حالات میں ویتنامیوں کو موقع مل گیا کہ وہ اپنی آزادی کا اعلان کر دیں۔

ستمبر 1945ء میں ہوچی منہ نے ''ڈیموکریٹک ریپبلک آف ویتنام'' کے ٹائٹل سے آزاد ویتنامی مملکت کا اعلان کر دیا۔ امریکہ کے صدر روز ویلٹ (Roozevelt) برطانیہ کے وزیراعظم چرچل (Churchill) اور سوویت یونین کے سربراہ سٹالن نے Potsdam کے مقام پر منعقد ہونے والی سربراہ کانفرنس میں ہوچی منہ کا طرف سے کیئے جانے والے اعلان آزادی کو تو تسلیم کر لیا مگر یہ فیصلہ بھی کر دیا کہ ویتنام کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے گا یعنی شمالی ویتنام اور جنوبی ویتنام۔ فیصلہ کے مطابق شمالی ویتنام کا کنٹرول چین کے پاس اور جنوبی ویتنام کا کنٹرول برطانیہ کے پاس رہے گا۔ فرانسیسی حکومت نے البتہ ہوچی منہ کے اعلان آزادی کو یکسر مسترد کر دیا اور دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر ویتنام پر ایک بار پھر اپنا قبضہ کرنے کے لئے بھرپور جنگی کارروائیاں شروع کر دیں۔

جنوری 1946ء میں برطانیہ نے ویتنام سے اپنی فوجیں نکالنے کی حامی بھر لی اور چین نے بھی فرانس کے ساتھ ایک معاہدہ کے تحت ویتنام سے اپنی دستبرداری کا اعلان کر دیا اور فرانس کو یہ حق دے دیا کہ وہ ویتنام پر دوبارہ اپنا کنٹرول قائم کر سکے۔ جواب میں فرانس نے رضامندی ظاہر کر دی کہ وہ چین کے مقبوضہ علاقے خالی کر دے گا۔ برطانیہ اور چین کی علیحدگی کے بعد فرانس نے ویتنام کے اوپر چڑھائی کر دی اور فرانس اور ویتنام کے درمیان زبردست جنگ چھڑ گئی۔ آغاز میں فرانس کی جدید فوج اور ہتھیاروں کے مقابلہ میں ویتنامی فوجوں کو انتہائی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر 1949ء میں جب ماؤزے تنگ نے ایک انقلاب کے ذریعے چین میں اپنی حکومت قائم کر لی تو ہوچی منہ کو بہت بڑا سہارا مل گیا اب ویتنام کو ایک ایسا ملک مل گیا۔ جہاں وہ اپنی فوج کو تربیت دے کر فرانس کے ساتھ بھرپور مقابلہ کے لئے تیار کر سکے۔ چین سے جنگی ساز و سامان بھی ویتنام کو ملنا شروع ہو گیا۔ فروری 1950ء میں ہوچی منہ نے ماسکو میں چین کے انقلابی لیڈر ماؤزے تنگ اور سوویت لیڈر سٹالن سے ملاقات کی۔ سوویت یونین نے ہوچی منہ کی زیر قیادت ڈیموکریٹک ریپبلک آف ویتنام کو تسلیم کر لیا اور تینوں لیڈروں کے درمیان طے پایا کہ فرانس کے خلاف جنگ میں ویتنام کی

پوری مدد کی جائے گی۔ 1`953ء تک ویتنامیوں نے اپنے ملک کے زیادہ تر علاقوں کو آزاد کروالیا تھا لیکن جنوبی ویتنام پر فرانسیسی فوج کا مضبوط کنٹرول تھا اور وہاں انہوں نے ویتنام کے سابق بادشاہ بودے BoDai کو سربراہ مملکت بنا کر بٹھا رکھا تھا۔

فرانس اور ویتنام کے درمیان جنگ جب طویل ہوگئی اور ویتنامیوں کی گوریلا کارروائیوں کے باعث فرانسیسی فوج کا نقصان زیادہ ہونے لگا تو فرانس کے عوام کی رائے جنگ کے خلاف ہونا شروع ہوگئی۔ عوام کی جانب سے جنگ جاری رکھنے کی مخالفت کی چار بنیادی وجوہات تھیں (1) 1946ء سے لے کر 1952ء تک فرانس کے نوے ہزار فوجی ہلاک، زخمی یا گرفتار ہو گئے (2) دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کے بعد فرانس کے عوام اپنی معاشی حالت بہتر بنانے پر توجہ چاہتے تھے (3) امریکہ کی طرف سے مارشل پلان کے تحت فرانس کی اقتصادی بحالی کے لئے جو رقم ملی اُس سے دوگنی ویتنام کے ساتھ جنگ میں خرچ ہوگئی (4) عوام نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ ویتنام میں فرانس کی جبری موجودگی کا کوئی اخلاقی جواز نہیں ہے۔

فرانسیسی فوج کے کمانڈر جنرل نوار (Navarre) نے اس صورت حال کے پیش نظر جنگ فوری نتیجہ خیز بنانے کا منصوبہ بنایا اور ایک بڑی جنگ کی تیاری کے لئے فوج کو Dieu Bean Phu میں بنائے گئے خصوصی ڈیفنس کمپلیکس میں جمع کرلیا۔ ویتنامی فوج نے کمپلیکس کے چاروں طرف سرنگیں کھود کر فرانسیسی فوج کو گھیر لیا۔ ویتنام کے 70000 سپاہی فرانس کی اٹھارہ ہزار فوج کو گھیرے میں لئے ہوئے تھے۔

13 مارچ 1954ء کو ویتنامی فوج نے فرانسیسی فوج پر حملوں کا آغاز کر دیا۔ 56 روز کے بعد فرانسیسی فوج نے پسپائی اختیار کر لی۔ 7 مئی 1954ء کو جب فرانسی فوج نے شکست تسلیم کی تو اس وقت تک اس کے سات ہزار (7000) فوجی مارے جا چکے تھے جبکہ گیارہ ہزار (11000) جنگی قیدی بن چکے تھے۔

اگلے ماہ امریکہ سوویت یونین برطانیہ اور فرانس کے وزرائے خارجہ نے سوئٹزرلینڈ کے شہر جنیوا (Geneva) میں ایک کانفرنس کا انعقاد کیا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ شمالی ویتنام بدستور ہو چی منہ کی قیادت میں رہے گا جبکہ جنوبی ویتنام پر حکومت کمیونزم کے سخت مخالف لیڈر Ngo Dinh Dien کریں گے۔ اس کے علاوہ فرانس مکمل طور پر ویتنام سے نکل جائے گا اور جولائی 1956ء سے قبل تمام ویتنام میں عام انتخابات کرائے جائیں گے جن میں عوام کی رائے لی جائے گی کہ وہ شمالی اور

جنوبی ویتنام کا اتحاد چاہتے ہیں یا دونوں حصوں کی الگ الگ حکومتیں چاہتے ہیں۔ یہ تجاویز ہوچی منہ اوران کے ساتھیوں کے لئے اگرچہ قابل قبول نہ تھیں مگر وقتی تقاضے کے مطابق انہیں قبول کرلیا گیا تاہم ویتنام کے دونوں حصوں کو جلد از جلد یکجا کرنے کی خواہش پوری شدت کے ساتھ ان کے دلوں میں موجود رہی۔

جنوبی ویتنام کے حکمران جانتے تھے کہ ویتنام کے عوام کی اکثریت ہوچی منہ کی قیادت کو پسند کرتی ہے اور الیکشن ہونے کی صورت میں جنوبیب ویتنام کا وجود ختم ہو جائے گا لہٰذا انہوں نے جنیوا معاہدہ کے برعکس عام انتخابات کرانے سے انکار کر دیا۔ امریکی حکومت کی مکمل سرپرستی انہیں حاصل تھی اور امریکہ نہیں چاہتا تھا کہ تمام ویتنام کمیونسٹ بلاک میں چلا جائے لہٰذا امریکہ کی اشیر باد سے جنوبی ویتنام کے حکمران ڈیم Diem نے 1954ء میں انتخابات نہ کرانے کا اعلان کر دیا ادھر ہوچی منہ نے پوری ویتنامی قوم کو ملک کے اتحاد اور مکمل آزادی کے لئے جدوجہد تیز کرنے کی کال Call دے دی۔ اس کال پر لبیک کہتے ہوئے لوگ گھروں سے نکل آئے۔ انہوں نے جنگلوں میں جا کر مسلح گروپ تشکیل دے دیئے جو جنوبی ویتنام کے اندر گھس کر گوریلا کارروائیاں کر کے واپس چلے جاتے۔ وہ بطور خاص جنوبی ویتنام کے اہم سرکاری اہل کاروں کو نشانہ بناتے۔ 1959ء تک ڈیم (Deim) حکومت کے 1200 سے زائد انتہائی اہم اہل کاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

ہوچی منہ نے گوریلا جنگ تیز کرنے کے لئے دسمبر 1960ء میں نیشنل فرنٹ فار دی لبریشن آف ساؤتھ ویت نام (NLF) کے قیام کا اعلان کر دیا۔ نیشنل لبرشن فرنٹ میں ایک درجن سے زائد سیاسی اور مذہبی جماعتیں شامل تھیں۔ نیشنل لبرشن فرنٹ کی کارروائیوں کا طریقہ کار بالکل وہی اپنایا گیا جو چین میں ماؤزے تنگ نے اپنی کامیابی کے لئے استعمال کیا تھا۔ یہ طریقہ کار بہت کامیاب رہا اور امریکی اتحادی جنوبی ویتنام کے حکمرانوں کی نیندیں حرام ہوگئیں اور امریکہ کو براہ راست ویتنامی جنگ میں کودنا پڑا۔ 1964ء میں امریکہ کے صدر منتخب ہونے کے بعد ایل بی جانسن (Loyndon' B Johnson) نے ویتنام کے خلاف آپریشن رولنگ تھنڈر (Operation Rolling Thunder) کا آغاز کر دیا جس میں ویتنامی شہروں پر زبردست بمباری سمیت تمام وحشی فوجی کارروائی عمل میں لائی گئی۔ ابتدائی طور پر آپریشن رولنگ تھنڈر 8 ہفتوں کے لئے ترتیب دیا گیا تھا مگر ویتنامیوں کی ناقابل یقین مزاحمت کے باعث یہ آپریشن اگلے تین برس تک جاری رکھنا پڑا۔ اس عرصہ کے دوران امریکہ نے ویتنام پر دس لاکھ ٹن وزنی بم گرائے مگر پھر بھی کامیابی حاصل نہ ہو

سکی۔اس جنگ میں امریکیوں کا بھی شدید جانی نقصان ہوا۔

امریکہ کے ساتھ جاری جنگ کے دوران ہی 2 ستمبر 1969ء کو ہو چی منہ 79 برس کی عمر میں دل کا دورہ پڑنے سے وفات پا گئے۔اسی روز ہو چی منہ نے 1945ء میں ڈیموکریٹک ریپبلک آف ویتنام کی آزادی کا اعلان کر کے صدارت کا عہدہ سنبھالا تھا جو اُن کی وفات تک اُن کے پاس رہا۔ ہو چی منہ کی وفات کے بعد بھی ان کے ساتھیوں نے اپنے قائد کی جاری کردہ جدوجہد جاری رکھی اور چھ برس بعد وہ امریکیوں کو شکست دے کر جنوبی ویتنام پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ویتنام مکمل طور پر آزاد ہو گیا۔ ہو چی منہ کی وفات سے لے کر ویتنام کی مکمل آزادی تک کے چھ برسوں میں ہو چی منہ کے ساتھیوں نے ان کی جگہ کسی کو صدر نہ بنایا بلکہ اجتماعی قیادت کے ذریعے ملک کی حکومت کو چلایا اور جنگ آزادی بھی جاری رکھی۔ ویتنام کی مکمل آزادی کے بعد سابق جنوبی ویتنام کے دارالحکومت سیگان (Saigon) جو کہ ویتنام کا سب سے بڑا شہر ہے کو ہو چی منہ سٹی کا نام دے دیا گیا اور ڈیموکریٹک ریپبلک آف ویتنام کو تبدیل کر کے ملک کا نام سوشلسٹ ریپبلک آف ویتنام رکھ دیا گیا۔

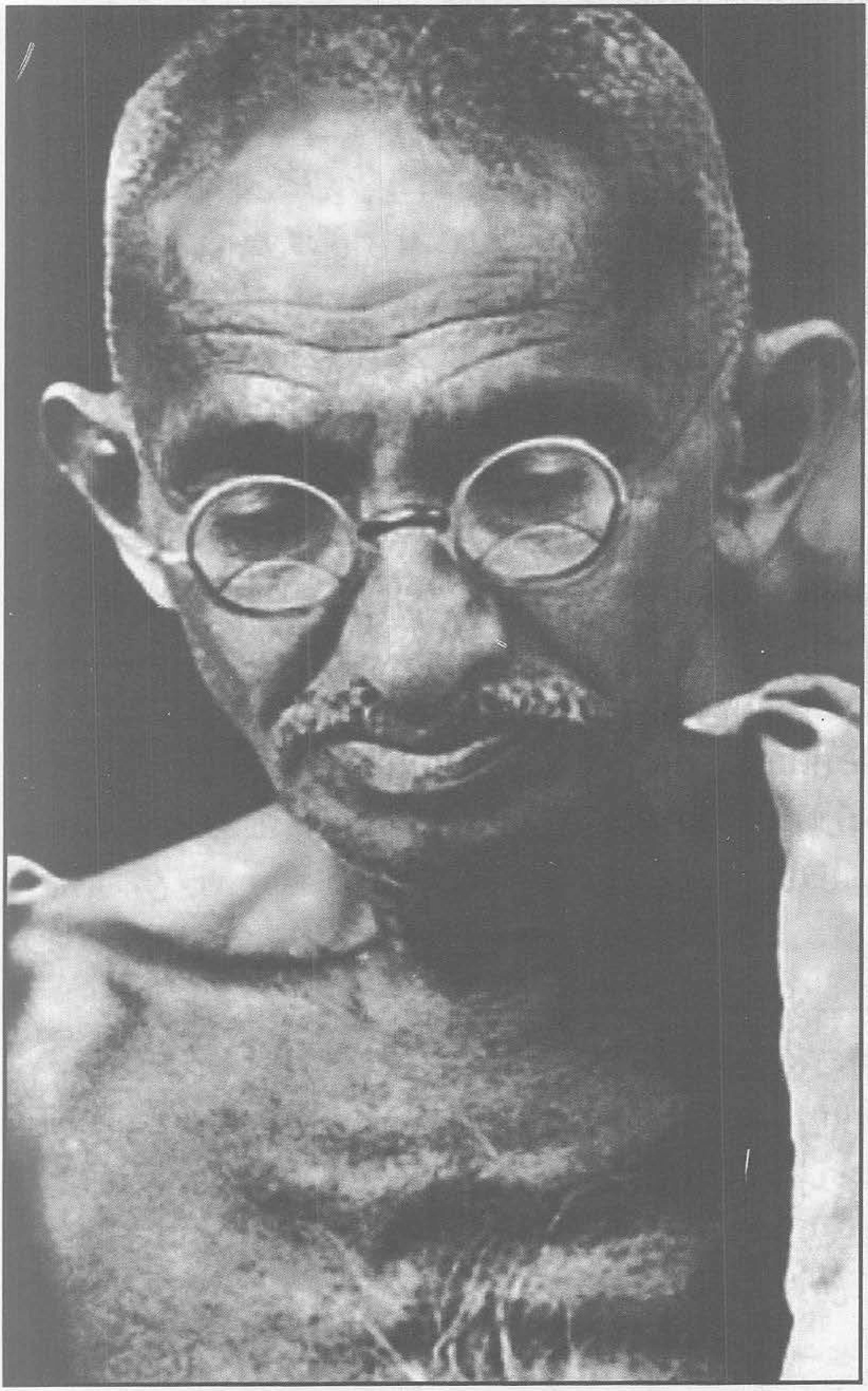
مہندس گاندھی

MOHANDAS GANDHI

ہندوستان کی آزادی کے ہیرو اور بابائے قوم

مہندس کرم چند گاندھی جنہیں ہندوستان میں مہاتما گاندھی اور سرکاری طور پر بابائے قوم کے القابات سے یاد کیا جاتا ہے ہندوستان کی تاریخ کے ایک منفرد اور بہت بڑے لیڈر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ان کا لباس، اُن کے خیالات، اُن کا طرز حیات اور ان کا طریقہ سیاست ہندوستان بلکہ دنیا کے تمام اہم لیڈروں سے مختلف تھا۔ انہوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا اور آزادی کے ہیرو کہلائے۔ ان کی سیاست کو سمجھنا عام سیاستدانوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ ان کی سیاست بیک وقت پرامن اور پرتشدد رہی۔ انہوں نے زندگی کے ابتدائی سال جنوبی افریقہ میں گزارے اور وہاں کی سیاست میں بھرپور حصہ لیا اور بعد میں ہندوستان آ کر انڈین نیشنل کانگرس کے پلیٹ فارم سے ہندوؤں کے عظیم لیڈر کے طور پر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔

مہندس کرم چند گاندھی 2/اکتوبر 1869ء کو پور بندر قصبہ میں پیدا ہوئے جو آج کل ضلع گجرات کا حصہ ہے۔ ان کے والد کرم چند گاندھی برٹش انڈیا کے زیر انتظام کاٹھی واڑ ایجنسی کی ریاست پوربندر کے دیوان رہے۔ مہندس گاندھی کرم چند گاندھی کی چوتھی بیوی میں سے پیدا ہوئے۔ مئی 1883ء میں 13 برس کی عمر میں مہندس گاندھی کی شادی ایک 14 سالہ لڑکی Kasturbai سے ہوگئی۔ یہ شادی ان کے والدین کی پسند تھی۔ 1985ء میں جب مہندس گاندھی 15 برس کے تھے، کے ہاں پہلا بچہ پیدا ہوا جو زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکا۔ اسی سال مہندس گاندھی کے والد کرم چند گاندھی بھی فوت ہو گئے۔ مہندس اور کستور بائی کے ہاں مزید چار بچے پیدا ہوئے اور

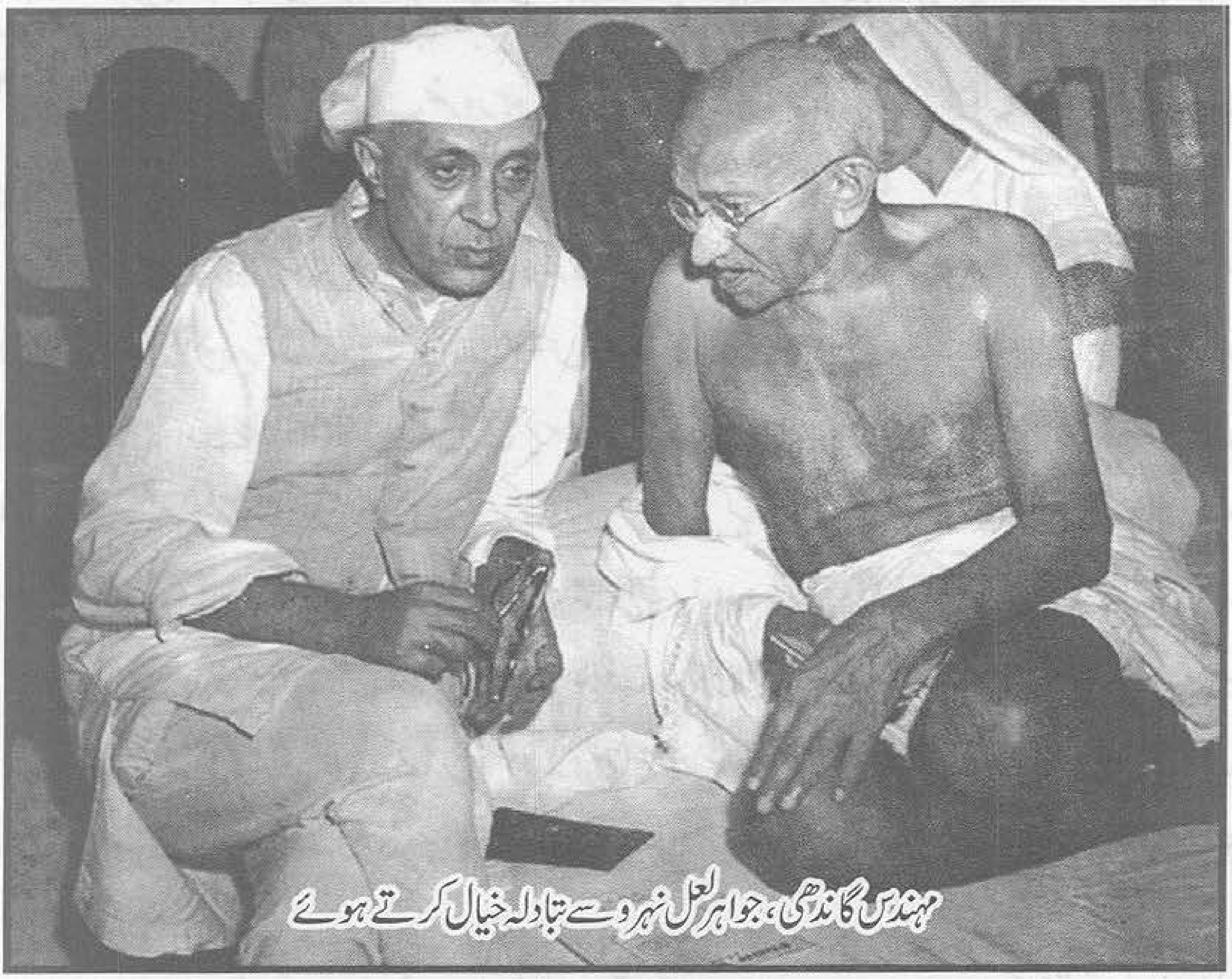


چاروں بیٹے تھے۔ ہری لال 1888ء، مانی لال 1892ء، رام داس 1897ء اور دیوداس 1900ء میں پیدا ہوئے۔ مہندس گاندھی پوربندر مڈل سکول اور راج کوٹ کے ہائی سکول میں تعلیم کے دوران ایک درمیانے درجے کے طالبعلم تھے۔ انہوں نے بہاولنگر کے سمال داس کالج جو ضلع گجرات میں واقع تھا، سے میٹرک کا امتحان بمشکل پاس کیا۔ گاندھی کے والدین کی خواہش تھی کہ وہ بیرسٹر بنیں۔

6 ستمبر 1988ء مہندس گاندھی اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن روانہ ہو گئے اور وہاں قانون کی تعلیم کے حصول کے لئے یونیورسٹی کالج لندن میں داخلہ لیا۔ لندن میں قیام کے دوران مہندس گاندھی اپنی والدہ سے کئے ہوئے اس وعدے پر عمل کرتے رہے کہ ہندو عقیدہ کے مطابق گوشت نہیں کھانا، شراب نہیں پینا اور عورتوں کے ساتھ جنسی تعلقات نہیں رکھنے۔ گاندھی نے گوشت کی بجائے سبزی خوری کو اپنا معمول بنایا۔ پہلے پہل مہندس گاندھی کو مذہب سے زیادہ دلچسپی نہ تھی مگر بعد میں ہندومت اور عیسائیت پر شائع شدہ کتابوں کے مطالعہ کے بعد وہ خاصے مذہب پرست ہو گئے۔

مہندس گاندھی نے 10 جون 1891ء میں بار ایٹ لا کر لیا اور 12 جون 1891ء کو وہ انڈیا روانہ ہو گئے۔ وہاں جا کر انہیں معلوم ہوا کہ ان کی والدہ کا انتقال ہو چکا ہے اور ان سے یہ بات چھپائی گئی تھی تاکہ لندن میں ان کی تعلیم متاثر نہ ہو۔ بمبئی میں مہندس گاندھی نے وکالت کرنے کے لئے دفتر کھولا مگر ان کی وکالت زیادہ کامیاب نہ رہی اور دل برداشتہ ہو کر انہوں نے ایک ہائی سکول میں بطور ٹیچر ملازمت کے لئے درخواست دے دی مگر ناکامی پر وہ راج کوٹ چلے گئے اور وہاں چھوٹا سا کاروبار شروع کر دیا۔ 1893ء میں مہندس گاندھی کو جنوبی افریقہ میں کاروبار کرنے والی ایک انڈین کمپنی ''دادا عبداللہ اینڈ کمپنی'' میں ایک سال کے کنٹریکٹ پر ملازمت مل گئی۔

جنوبی افریقہ جو کہ برطانوی سامراج کے زیر تسلط تھا میں مہندس گاندھی کو انڈین ہونے کے باعث متصبانہ رویہ کا شکار ہونا پڑا۔ انہیں ایک مرتبہ Pietermaritzbarg کے مقام پر ٹرین سے اس وقت نیچے پھینک دیا گیا جب انہیں فرسٹ کلاس سے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں جانے پر اصرار کیا گیا جبکہ ان کے پاس فرسٹ کلاس کی ٹکٹ تھی۔ اس کے علاوہ انہیں کئی بار ہوٹلوں میں داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ اس طرح کے متعدد واقعات ان کے ساتھ پیش آئے جن کے باعث انہیں یقین ہو گیا کہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانی ہونا ایک جرم ہے۔ سیاہ فام لوگوں کے ساتھ سفید فام لوگوں کے ظلم و ستم اور نسل پرستی جیسی لعنت نے گاندھی کے دل میں برطانوی سامراج کے خلاف نفرت پیدا کر دی۔ جنوبی افریقہ میں قیام کے دوران وہاں مقیم ہندوستانیوں کو ووٹ کا حق دلوانے کے لئے انہوں



مہندس گاندھی، جواہر لعل نہرو سے تبادلہ خیال کرتے ہوئے



نے بہت کوشش کی مگر انہیں کامیابی نہ مل سکی تاہم وہ ہندوستانیوں کو جنوبی افریقہ میں ایک فعال اور متحرک کمیونٹی بنانے میں کامیاب ضرور ہو گئے۔ انہوں نے 1894ء میں ناتال انڈین کانگرس کی بنیاد رکھی جس کے ذریعے ہندوستانیوں کی سیاسی قوت میں اضافہ کیا گیا۔

جنوری 1897ء میں جب مہندس گاندھی ڈربن کے دورہ پر گئے تو سفید فام آباد کاروں کے ایک گروہ نے اُن پر حملہ کر دیا۔ مگر ایک پولیس سپرنٹنڈنٹ کی بیوی کی مدد سے وہ اپنی جان بچانے میں کامیاب ہوئے۔ 1906ء میں نسل پرست حکومت نے ایک قانون نافذ کیا جس میں جنوبی افریقہ میں مقیم ہندوستانیوں کی رجسٹریشن کو لازمی قرار دیا گیا۔ 11 ستمبر 1906ء کو اس قانون کے خلاف منعقدہ ایک جلسہ میں گاندھی نے ہندوستانیوں پر زور دیا کہ وہ اس قانون کی مخالفت کریں مگر تشدد کا راستہ ہرگز نہ اپنائیں اور قانون کی خلاف ورزی پر جو بھی سزا ملے وہ برداشت کریں۔ ہندوستانیوں نے گاندھی جی کے اس منصوبہ کو اپنایا اور سات سال کی مسلسل جدوجہد میں مہندس گاندھی سمیت ہزاروں ہندوستانیوں کو جیل جانا پڑا۔ بالآخر سفید فام حکومت کو گاندھی جی کی بات سے اتفاق کرنا پڑا۔

مہندس گاندھی کی جنوبی افریقہ میں نسل پرستی کے خلاف اور سیاہ فام عوام کے حقوق کی بازیابی کے لئے جدوجہد کو نیلسن مینڈیلا نے بھی خراج تحسین پیش کیا اور جنوبی افریقہ کے دارالحکومت میں اُن کا مجسمہ نصب کروایا۔

1915ء میں مہندس گاندھی جنوبی افریقہ سے ہندوستان چلے گئے اور وہاں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ انہوں نے احمد آباد میں ایک نئی کمیونٹی (Community) آشرم قائم کی۔ آشرم میں وہ افراد رہ سکتے تھے جو عدم تشدد پر یقین رکھنے والے اور سوچ و بچار کرنے والے ہوں، جو کاشت کاری اور سوت کاتنے کو روزگار کا ذریعہ بناتے ہوں اور جن کے پاس نوکر چاکر اور ذاتی جاگیریں نہ ہوں۔ آشرم میں خواتین کو مکمل آزادی اور مساوی حقوق حاصل تھے۔ وہاں مکمل مذہبی رواداری تھی اور ذات پات کو مکمل طور پر نظر انداز کیا جاتا تھا۔

1919ء میں برطانوی حکومت نے رولٹ ایکٹ Roulatt Act نافذ کر دیا جس کے تحت ایسے افراد کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا جاتا تھا جن پر باغیانہ خیالات رکھنے کا شبہ ہو۔ مہندس گاندھی نے اس ایکٹ کے خلاف پرامن تحریک ''ست یا گرہ'' چلانے کا اعلان کر دیا۔ لاکھوں لوگ اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ اس تحریک کے دوران 1920ء میں برطانوی فوج کے ہاتھوں امرتسر

کے جلیانوالہ باغ میں عوام کے بے دریغ قتل عام کا گھناؤنا واقعہ پیش آیا۔ اس وقت مہندس گاندھی ہندوستانی سیاست میں انتہائی اہم مقام حاصل کر چکے تھے۔ انہوں نے انڈین نیشنل کانگرس کو از سر نو منظّم کیا اور نئی جدوجہد کا آغاز کیا۔ ان کی انگریز حکومت کے خلاف پرامن عدم تعاون اور برطانوی اشیاء کے بائیکاٹ کی پالیسی کے باعث لاتعداد ہندوستانیوں کو جیلوں کی سلاخوں کے پیچھے جانا پڑا۔

جنوبی افریقہ سے ہندوستان جا کر جب مہندس گاندھی نے انڈین نیشنل کانگرس میں شمولیت کی تھی تو ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کے بارے میں کم لوگوں کو معلومات تھیں مگر صرف 15 برس کے عرصہ کے دوران وہ کانگرس کے سب سے اہم لیڈر ثابت ہو گئے۔ مگر نمایاں حیثیت انہیں 1928ء میں ہی حاصل ہو گئی تھی جب ایک سال قبل برطانوی حکومت نے انڈیا کے لئے آئینی اصلاحات کی غرض سے سر جان سائمن Sir John Simon کی سربراہی میں ایک کمیشن بنایا مگر اس میں ہندوستان کی کسی ایک سیاسی جماعت میں سے بھی کوئی نمائندہ شامل نہیں کیا۔ اس پر کانگرس سمیت تمام انڈین سیاسی جماعتوں نے اس کمیشن کا بائیکاٹ کر دیا۔ گاندھی نے 1928ء میں کلکتہ میں منعقدہ کانگرس کے اجلاس میں پیش کردہ ایک قرارداد میں برطانوی حکومت کو دھمکی دی کہ وہ ہندوستان کے مقام اور مرتبہ کے مطابق اُسے اہمیت دے ورنہ اس کے خلاف ہندوستان میں مکمل آزادی کے لئے تحریک کا آغاز کر دیا جائے گا۔

31 دسمبر 1929ء کو لاہور میں ہندوستان کا جھنڈا لہرا دیا گیا اور 26 جنوری 1930ء کا دن لاہور میں منعقدہ انڈین نیشنل کانگرس کے اجلاس میں آزادی کے دن کے طور پر منایا گیا۔ مارچ 1930ء میں مہندس گاندھی نے برطانوی حکومت کی طرف سے نمک پر لگائے گئے ٹیکس کے خلاف احمد آباد سے لے کر دہلی تک ایک لانگ مارچ کا اعلان کیا۔ 400 کلومیٹر فاصلہ پر محیط یہ لانگ مارچ 12 مارچ سے شروع ہو کر 6 اپریل 1930ء تک جاری رہا۔ ہزاروں لوگوں نے اس مارچ میں گاندھی جی کا ساتھ دیا۔ اس کے نتیجے میں 60 ہزار افراد کو جیل جانا پڑا۔ برطانوی حکومت نے نمائندے لارڈ ایڈورڈ اروِن (Lord Edward Irwin) نے مہندس گاندھی کیس اتھ مذاکرات کا فیصلہ کیا اور مارچ 1931ء کو ان کے درمیان ایک معاہدہ پر دستخط ہو گئے جس کے نتیجہ میں حکومت کی طرف سے تمام گرفتار شدہ افراد کو رہا کرنے کا اعلان کیا گیا اور گاندھی جی کی طرف سے حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک واپس لینے کا اعلان ہوا۔

1931ء میں گاندھی جی کو انڈین نیشنل کانگرس کی نمائندگی کے لئے برطانوی حکومت کی طرف

سے لندن میں منعقدہ ''گول میز کانفرنس'' میں شرکت کا موقع دیا گیا۔ اس کانفرنس میں گاندھی جی نے اپنا مخصوص لباس دھوتی اور شال پہن کر شرکت کی۔ اپنے لباس کی وجہ سے وہ برطانیہ میں توجہ کا مرکز رہے۔ 8/مئی 1933ء کو گاندھی جی نے ہری جان موومنٹ کے لئے 21 دن کا روزہ رکھا۔ 1934ء میں گاندھی پر تین بار قاتلانہ حملے ہوئے مگر وہ بچ گئے۔

جب انڈین نیشنل کانگرس نے وفاقی سکیم کے تحت اقتدار میں آنے کے لئے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا تو گاندھی جی نے کانگرس سے استعفیٰ دے دیا اور دوبارہ 1936ء میں کانگرس کی سربراہی قبول کی۔ لکھنؤ میں منعقدہ کانگرس کے اجلاس میں جواہر لعل نہرو کو کانگرس کا صدر بنا لیا گیا۔ 1938ء میں جب سبھاس بوسے (Subhas Bose) کانگرس کے صدر منتخب ہوئے تو گاندھی جی کے ان کے ساتھ اختلافات پیدا ہو گئے۔ اختلاف کی بنیادی وجہ بقول گاندھی سبھاس کی جمہوریت سے عدم دلچسپی اور عدم تشدد کی پالیسی سے انحراف تھا۔ بعد میں کانگرس کے زیادہ تر عہدیدار گاندھی جی کے اصولوں سے انحراف پر سبھاس کے خلاف ہو گئے جس پر انہیں صدارت سے مستعفی ہونا پڑا۔

1939ء میں اُس وقت دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا جب نازی جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ پہلے پہل تو گاندھی جی نے اس جنگ میں برطانوی حکومت کو اپنی حمایت کا یقین دلا دیا مگر گاندھی کی طرف سے دیگر کانگرسی لیڈروں اور عہدیداروں سے مشورہ کئے بغیر برطانوی حکومت کی یک طرفہ حمایت پر پارٹی میں شدید مخالفت ہوئی اور تمام منتخب عہدیداروں نے استعفیٰ دے دیا۔ اس پر گاندھی جی کو اپنا مؤقف بدلنا پڑا اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ جنگ عظیم میں انڈین نیشنل کانگرس کی برطانوی حکومت کے لئے حمایت جنگ کے اختتام پر ہندوستان کی آزادی کے وعدہ سے مشروط ہو گی۔ جیسے جیسے جنگ زور پکڑتی گئی گاندھی کے برطانوی حکومت سے مطالبات بڑھتے گئے اور پھر ایک قرارداد کے ذریعے انہوں نے برطانیہ پر زور دیا کہ وہ ہندوستان سے نکل جائے۔ یعنی Quit India Quit India Movement گاندھی جی اور کانگرس کی طرف سے ہندوستان کی آزادی کے لئے بہترین ہتھیار ثابت ہوا۔ 1946ء میں برطانیہ کی کابینہ کے وزراء پر مشتمل ایک وفد ہندوستان بھیجا گیا جسے ''کیبنٹ مشن'' (British Cabinet Mission) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، نے ہندوستان سے مسلمانوں کی اکثریت والی ریاستوں کو خودمختار حیثیت دینے کی تجویز دی۔ گاندھی نے اس منصوبہ کو مسترد کر دیا اور کہا کہ وہ کسی صورت میں ہندوستان کی تقسیم نہیں ہونے دیں گے۔ تاہم کانگرس کے لیڈر جواہر لعل نہرو اور پٹیل کا نقطۂ نظر مختلف تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر کانگرس نے

وزارتی کمیشن کے منصوبہ کو قبول نہ کیا تو حکومت آل انڈیا مسلم لیگ کے ہاتھوں میں کھلونا بن جائے گی۔ ادھر ہندو مسلم فسادات میں 1946ء سے لے کر 1947ء تک ہزاروں لوگ ہلاک ہو چکے تھے۔ بالآخر گاندھی کو تقسیم ہند اور قیام پاکستان کا مطالبہ تسلیم کرنا پڑا اور 14/اگست 1947ء کو ہندوستان تقسیم ہو گیا اور پاکستان دنیا کے نقشہ پر ایک آزاد اسلامی مملکت کے طور پر جلوہ افروز ہو گیا۔ بہت سے انتہا پسند ہندوؤں نے گاندھی جی کی غلط پالیسیوں کو ہندوستان کی تقسیم کا سبب قرار دیا۔ ہندوستان کی آزادی کا باضابطہ اعلان 15/اگست 1947ء کو ہوا۔

مہندس گاندھی اپنی سیاسی جدوجہد کے دوران 1922ء، 1930ء، 1933ء اور 1942ء میں گرفتاری کے بعد پابند سلاسل رہے۔ انہوں نے جیل میں طویل بھوک ہڑتال بھی کی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر جیل میں بھوک ہڑتال کے باعث ان کی موت واقع ہو جائے تو وہ بین الاقوامی خبروں کا مرکز بن جائیں گے اور برطانوی حکومت کے لئے یہ امر انتہائی شرمندگی کا باعث ہو گا۔ 13/جنوری 1948ء کو گاندھی نے ہندوستانی سیاسی لیڈروں کے درمیان باہمی چپقلش کو ختم کروانے کے لئے تادم مرگ روزہ رکھ لیا۔ 5 روز کے بعد تمام سیاسی لیڈروں نے گاندھی جی کا روزہ تڑوانے کی خاطر اپنے باہمی اختلافات ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

20/جنوری 1948ء کو گاندھی جی پر ایک شدید قاتلانہ حملہ ہوا مگر وہ بچ گئے۔ صرف دس روز بعد 30 جنوری 1948ء کو وہ صبح کی پوجا کے لئے گھر سے نکلے تو ایک انتہا پسند ہندو نتھو رام نے ان پر ایک پستول سے فائر کئے جو جان لیوا ثابت ہوئے اور اس طرح ہندوستان کے یہ عظیم لیڈر اس دنیا فانی سے کوچ کر گئے۔ کہا جاتا ہے کہ مرتے وقت گاندھی جی کی زبان سے آخری الفاظ ادا ہوئے "اے رام"۔

گاندھی جی کی وفات کا اعلان کرتے وقت ہندوستان کے وزیر اعظم جواہر لعل نہرو نے ریڈیو پر یہ الفاظ ادا کئے۔

"دوستو اور ساتھیو! ہماری زندگیوں میں سے روشنی چلی گئی ہے اور اب ہر طرف اندھیرا ہے اور مجھے بالکل سمجھ نہیں آ رہی کہ میں کیا کہوں اور کیسے کہوں ...... ہمارے محبوب قائد جنہیں ہم باپو کہتے ہیں بابائے قوم اب دنیا میں موجود نہیں رہے۔"

! گاندھی جی کی خواہش کے مطابق اُن کی راکھ ہندوستان کے تمام دریاؤں میں بکھیری گئی۔

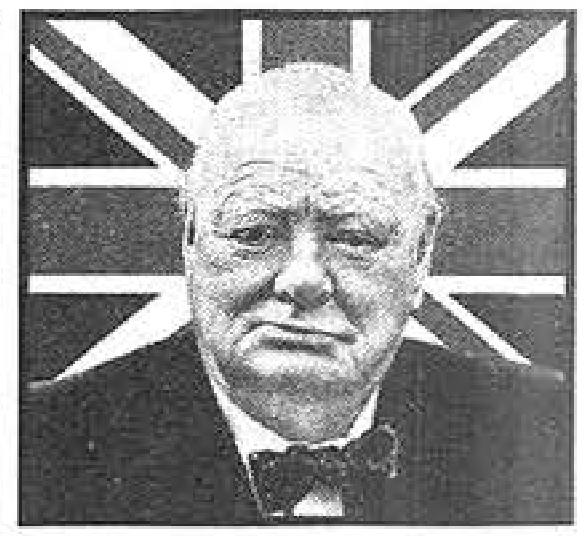
20 ویں صدی کے 20 قائد


احمد بن بیلا (الجزائر)

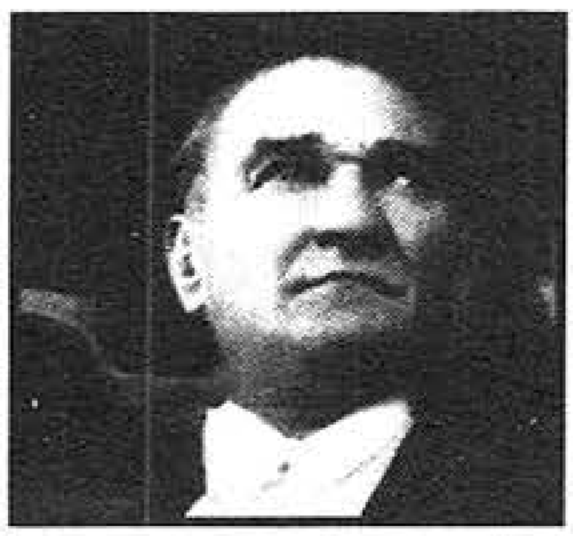

ایف ڈی روز ویلٹ (امریکہ)


احمد سوئیکارنو (انڈونیشیاء)


امام خمینی (ایران)


چرچل (برطانیہ)


قائداعظم (پاکستان)


کمال اتاترک (ترکی)


نیلسن مینڈیلا (جنوبی افریقہ)


ہٹلر (جرمنی)


ماوزے تنگ (چین)


شاہ عبداللہ عزیز (سعودی عرب)


لینن (سویت یونین)


کم ال سنگ (شمالی کوریا)


چارلس ڈیگال (فرانس)

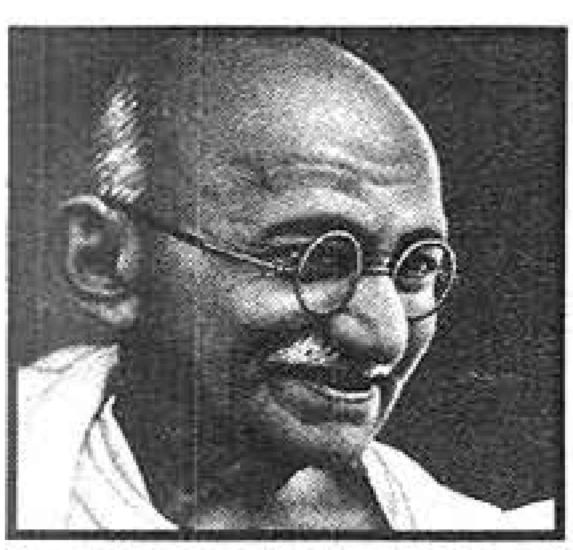

یاسر عرفات (فلسطین)


فیڈل کاسترو (کیوبا)


نکرومہ (گھانا)


جمال عبدالناصر (مصر)


ہوچی منہ (ویت نام)


مہندس گاندھی (ہندوستان)